Course Title: BBA/BBA(T&T) BCA/BHA/BH,Science/BA.Mus/BA.FA (UG)

LANGUAGE URDU

State Education Policy (SEP) 2024-25 and on wards

Third Semester

Course Content: Khake , Qasida , Marsiya , Grammar and Interview

Course Credits	Total Contact Hours	Summative Assessment Marks =80
3	4/week	Farmative Assessment Marks = 20

UNIT : 1

خاکے

۱) گدڑی کا لال۔نور خان — مولوی عبدالحق
۲) دوزخی — عصمت چغتائی
۳) جگر مرادآبادی — شاہد احمد دہلوی
۴) حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق — مفتی ثناءاللہ محمود

UNIT : 2

قصیدہ اور مرثیہ

۱) ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی — محمد رفیع سوداؔ
۲) ساون میں دیا، پھر یہ شوال دکھائی — شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ
۳) نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری — میر انیسؔ

UNIT : 3

گرامر

UNIT : 4

انٹرویو (مصاحبہ نگاری)

۱) شمس الرحمٰن فاروقی — مناظر عاشق ہرگانوی
۲) کنڑا ادیبوں سے ملاقات

مولوی عبدالحق

گڈری کا لال۔نور خان

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں، اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسیہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے۔انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے مس ک امرا اور غریب کا کوئی فرق نہیں آ ہے۔ پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے نور خاں مرحوم کنٹجنٹ کے اول رسالے میں سپاہی سیبھرتی ہوئے۔انگریزی افواج میں حیدرآباد کی کنٹجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہوسکتا تھا، بہت دیکھ بھال ہوتی تھی، بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتیتھے تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفا اس میں بھرتی کیے جائیں۔یہی وجہ ہے کہ کنٹجنٹ والے عزت کی نظر سید یکھے جاتے تھے لیکن بعد میں یہ قید اٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ پہلے زمانہ میں سپاہ گری بہت معزز پیشہ سمجھا تا تھا اب اس میں اور دوسرے پیشوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے ہر کوئی اس کی قدر نہیں کرسکتا۔اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔کرنل نواب افسر الملک بہادر بھی نور خاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں، کنٹجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسط سے نواب، کرنیل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدیدار ہیں۔لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نور خاں بھی ہے؟

اول رسالے کے بعض لوگوں سیمعلوم ہوا کہ خان صاحب مرحوم فوج میں بھی بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض شناسی میں مشہور تھے، یہ ڈرل انسٹکر ٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہوکر آتے تھے، ڈرل سکھاتے تھے۔اس لیے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے۔ وہ بڑے شہسوار تھے اور گھوڑے خوب پہچانتے تھے، بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے انہوں نے درست کیے گھوڑے کو سدھانے اور پھیرنے میں انہیں کمال تھا۔ چونکہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے۔گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔ان کے افسران کی مستعدی اور خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھے۔لیکن کھرے پن سے وہ بعض اوقات ناراض ہوجاتے تھے۔ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نیان سے کسی بات پر خفا ہوکر جیسا کہ انگریزوں کا عام قاعدہ ہے انہیں ڈیم کہہ دیا۔ یہ تو گالی تھی۔خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے انہوں نے فوراً رپورٹ کردی۔لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہوجائے اور آگے نہ بڑھے۔مگر خاں صاحب نیا یک نہ سنی، معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا۔کمانڈنگ

افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اس سے کہا گیا کہ خاں صاحب سے معافی مانگے، ہر چند اس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اسے معافی مانگنی پڑی۔ ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے۔

اچھے برے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ شریف افسر خاں صاحب کی سچائی اور دیانت داری اور جفاکشی کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کو اپنی اردلی میں رکھتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے کہ جن کے سر میں خنّاس سمایا ہوا تھا۔ انہیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور وہ ہمیشہ ان کے نقصان کے درپے رہتے تھے۔ ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خودداری کو جوہر شرافت سمجھتے تھے۔ لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا تو اسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں۔ تاہم ان کے اکثر انگریز افسران ان پر بہت مہربان تھے۔ خاص کر کرنل فرن ٹین ان پر بڑی عنایت کرتے تھے اور خاں صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید کسی اور پر ہو۔ جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفیٰ دیا تو اپنا تمام مال واسباب اور سامان جو ہزار ہا روپے کا تھا خاں صاحب کے سپرد کر گئے۔ یہ امر انگریز افسروں کو بہت ناگوار ہوا۔ اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا اور اس نے کرنل موصوف کو لکھا کہ آپ نے ہم پر اعتماد نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا تمام قیمتی سامان حوالے کر گئے۔ اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کر جاتے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کر کے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے۔ اگر اب بھی لکھیں تو اس کا انتظام ہوسکتا ہے۔ کرنل نے جواب دیا کہ مجھے نور خاں پر تمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرور نہیں ہے۔ اس پر یہ لوگ اور برہم ہوئے۔ ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز میم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی۔ چلتے وقت واپس کرنی بھول گئے۔ اب تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو۔

خان صاحب نے کہا میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا۔ آپ کرنل صاحب کو لکھئے وہ اگر مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ وہ اس جواب پر بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟ خاں صاحب نے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور ہمیں کسی کو اس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں۔ غرض وہ بڑبڑاتا ہوا کھسیانا ہو کر چلا گیا۔ خاں صاحب نے ایک انگریزی محرر سے اس سامان کی ایک مکمل فہرست تیار کرائی اور کچھ تو خود خریدی اور کچھ نیلام کے ذریعہ بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا دوسرا کوئی افسر، جب ملازمت سے قطع تعلق کر کے جانے لگا تو اس نے ایک سونے کی گھڑی، ایک عمدہ بندوق اور پانسو روپے نقد بطور شکرانے کے خاں صاحب کو دیے۔ خاں صاحب نے لینے سے انکار کیا اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر انہوں نے سوائے بندوق کے دوسری کوئی چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں۔

کرنل اسٹوارٹ بھی جو ہنگو لی چھاؤنی کے کمانڈگ افسر تھے، ان پر بہت مہربان تھے، رسالے کے شریف انگریزوں سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو نقصان بہت پہنچائیں گے۔ وہ ان کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے خوشامد سے انہیں چڑ تھی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے خاں صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انہوں نے کہا میں سائیس نہیں ہوں۔ اس نے ایسا جواب کاہے کو سنا تھا،

بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر کیا کرتا۔ آخر باگ درخت کی ایک شاخ سیاٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق کہ باگ شاخ سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد، بہت جھنجھلایا، بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا لیکن وہ خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا تم نے خوب کیا۔

خان صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں سمجھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں، وہ بیمار بن گئے اور اسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی برائاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں کی ہوتیں۔ بعض اوقات اس کی خوباں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔

کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ ہو مسٹر ہنکن ناظم پولیس سے سفارش کر کے انہیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں مگر خاں صاحب نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہا اب میں اپنے وطن دولت آباد میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش فرما دیں تو بہت اچھا ہو۔ کرنل صاحب بہت اصرار کرتے رہے کہ دیکھو تمہیں پولیس میں بہت اچھی خدمت مل جائیگی انکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے۔ آخر مجبور ہو کر نواب مقتدر جنگ بہادر صوبے دار صفدر اورنگ آباد سے سفارش کی۔ صوبے دار صاحب کی عنایت سے وہ قلعۂ دولت آبادی کی جمیب کے جمعدار ہو گئے اور بہت خوش تھے۔

نواب مقتدر جنگ کے بعد نواب بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کی صوبے داری پر آئے، وہ بھی خاں صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اسی زمانہ میں لارڈ کرزن وائسرائے دولت آباد تشریف لائے۔ خاں صاحب نے سلامی دینے کی تیاری کی، کئی توپیں ساتھ ساتھ رکھ کر سلامی دینی شروع کی۔ لارڈ کرزن گھڑی نکال کر دیکھ رہے تھے۔ جب سلامی ختم ہوئی تو نواب صاحب سے خاں صاحب کی تعریف کی۔ سلامی ایسے قاعدے اور انداز سے دی کہ ایک سکنڈ کا فرق نہ ہونے پایا۔ نواب صاحب نے اس کا تذکرہ خاں صاحب سے کیا اور کہا کہ میاں اب تمہاری خیر نہیں معلوم ہوتی۔ لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگرٹ دان نکال کر سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلامی کر کے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگرٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگرٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدیداران کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ لہو کے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے۔ بعد میں بہت لے دے کی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی، اس پر چون و چرا کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسے اتفاق کہیے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ ریاست کے مالیے کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعۂ دولت آباد بھی آ گیا۔ اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آ گئے۔

دولت آباد میں ان کی کچھ زمین تھی۔اس میں باغ لگانا شروع کر دیا۔مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں آ پہنچے۔خاں صاحب بیٹھے گھاس کھرپ رہے تھے۔مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اٹھ کر سلام کیا۔پوچھا کیا حال ہے کہنے لگے آپ کی جان و مال کو دعا دیتا ہوں، آپ کی بدولت گھاس کھودنے کی نوبت آ گئی ہے۔مسٹر واکر نے کہا کہ یہ بہت اچھا کام ہے، دیکھو تمہارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہیں، ایک ایک آنے کی انجیر بیچو تو کتنی آمدنی ہو جائیگی۔خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کمبخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگا دے، تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیر لدے ہوئے تو دیکھ لیے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑ گل جاتے ہیں، کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرندے کھا جاتے ہیں۔اور پھر ہماری دن رات کی محنت۔مسٹر واکر مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر آئے تھے۔ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں۔تھوڑی ہی دیر میں اور چند باتوں میں آدمی ایسا پرکھ لیتے تھے کہ حیرت ہوتی ہے پھر جیسا وہ آدمی کو سمجھتے ہیں ویسا ہی نکلتا ہے۔کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ڈاکٹر صاحب ایسے قابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔فوراً ہی خاں صاحب کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ڈاکٹر صاحب کا برتاؤ ان سے بہت شریفانہ اور دوستانہ تھا۔نواب بزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے، مقبرہ کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ڈاکٹر صاحب نے سفارش کر کے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کرا دیا۔

نواب بزور جنگ کے پاس ایک گھوڑا تھا۔وہ اسے بیچنا چاہتے تھے۔کلب میں کہیں اس کا ذکر آیا۔ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے گھوڑے کی ضرورت ہے اسے میں خرید لوں گا۔مگر پہلے نور خاں کو دکھا لوں، وہاں سے آ کر ڈاکٹر صاحب نے خاں صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ بھئی اس گھوڑے کو دیکھ آؤ۔کوئی عیب تو نہیں، خاں صاحب نے کہا آپ نے غضب کیا میرا نام لے دیا۔گھوڑے میں کوئی عیب ہوا تو میں چھپاؤنگا نہیں اور صوبیدار صاحب مفت میں مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ڈاکٹر صاحب نے کہا تم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو، کل جا کے ضرور گھوڑا دیکھ لو۔خاں صاحب گئے۔گھوڑا نسل کا تو اچھا تھا مگر پانچوں شرعی عیب موجود تھے۔انہوں نے صاف صاف آ کے کہہ دیا اور ڈاکٹر صاحب نے خریدنے سے انکار کر دیا۔صوبیدار آگ بگولا ہو گئے۔دوسرے روز مقبرے میں آئے اور باغ کا رجسٹر منگایا اور نور خاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر حرفوں اور لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا مگر انہوں نیاس کی تلافی کر دی، یہ سُن کر صوبے دار صاحب اور بھی جھنجھلائے۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پا کر حیدر آباد چلے گئے۔ان کی خدمت کا دوسرا انتظام ہو گیا۔کچھ دنوں بعد ڈاکٹر صاحب ناظم تعلیمات ہو گئے اور میں ان کی عنایت سے صدرِ مہتمم، تعلیمات ہو کر اورنگ آباد آیا۔ڈاکٹر صاحب ہی نے مجھے نور خاں سے ملایا اور ان کی سفارش کی۔ڈاکٹر صاحب نے انہیں عارضی طور پر دولت آباد میں مدرس کر دیا تھا، میں نے عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرر کر دیا۔وہ مدرسی اور محرری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرسوں اور محرروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الاؤنس بھی جاری ہو گیا۔

اعلیٰ حضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب و ہوا کو بہت پسند فرمایا اور ایک عظیم الشان باغ

لگانے کا حکم دیا۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا اور ان سے بہتر یہ کام کوئی کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخر اس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جوان کی طبیعت کے مناسب تھی اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے اور جب تک دم میں دم رہا اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانت داری سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام تو اور بھی کرتے لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی، بات کی اور معاملے کی، ان کی سرشت میں تھی اور خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے، وہ سچ کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے اسی میں انہیں نقصان بھی اٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے دن ہو، رات ہو، ہر وقت کام کرنیکو تیار۔ اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔ کسی کام کو کہیے تو ایسی خوشی سے کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے پکے اور بڑے وضعدار تھے، چونکہ ادنیٰ اعلیٰ سب ان کی عزت کرتے تھے اس لیے ان کے غریب دوستوں سیبہت سے کام نکلتے تھے۔ ان کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف ان کے گھر پہنچ جاتے اور وہ ان سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آ کر ٹھہر جاتے تھے ان کی دعوت بھی کر دیتے تھے، بعض اوقات ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبھی کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خوددار ایسے کہ کسی سے ایک پیسے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ مجھ سے انہیں خاص انس تھا، میں کوئی چیز دیتا تھا تو کبھی انکار نہ کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے، مٹھاس کے بیحد شائق تھے۔ ان کا قول تھا کہ اگر کسی کو کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں مجھ میں اگر استطاعت ہو تو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں۔'' انہیں مٹھاس کو کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اکثر جیب میں گڑ رکھتے تھے۔ ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے، قسم قسم کے تکلف کے کھانے تھے۔ خاں صاحب نے چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا۔ ایک صاحب جو دعوت میں شریک تھے یہ خیال کر کے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا کہنے لگے کہ'' حضرت یہ میٹھا ہے۔'' مگر انہوں نے کچھ پروانہ کی اور برابر کھاتے رہے، جب وہ ختم ہو گیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا۔ ان حضرت نے پھر ٹوکا کہ حضرت یہ میٹھا ہے، انھوں نے کچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا۔ جب کبھی وہ کسی دوست کے ہاں جاتے وہ انھیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے۔

خان صاحب بہت زندہ دل تھے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی، وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا۔ آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب جب کبھی اورنگ آباد آتے تو اسٹیشن سے اترتے ہی اپنا روپیہ پیسہ سب ان کے حوالے کر دیتے تھے اور

سب خرچ ان ہی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جانے سے ایک روز قبل وہ حساب لے کر بیٹھتے، بعض وقت جب بدھ نہ ملتی تو آدھی آدھی رات تک لیے بیٹھے رہتے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب کہتے کہ خاں صاحب یہ تم کیا کرتے ہو، جو خرچ ہوا ہوا باقی جو بچا وہ دے دو یا زیادہ خرچ ہوا ہو تو لے لو۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے، جب تک حساب ٹھیک نہ بیٹھتا انہیں اطمینان نہ ہوتا۔ چلتے وقت کہتے کہ لیجیے صاحب یہ آپ کا حساب ہے اتنا خرچ ہوا اور اتنا بچا۔ یا کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا تو کہتے کہ اتنے پیسے ہمارے خرچ ہوئے یہ ہمیں دلوایئے۔ کبھی ایسا ہوا کہ انہیں کچھ شبہ ہوا تو جانے کے بعد پھر حساب لے کر بیٹھتے اور خط لکھ کر بھیجتے کہ اتنے آنے آپ کے رہ گئے تھے، وہ بھیجے جاتے ہیں، یا اتنے پیسے میرے زیادہ خرچ ہو گئے تھے، وہ بھیج دیجیے گا، ڈاکٹر صاحب ان باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے۔

وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے، اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضعدار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کے بڑھاپے پر لوگوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے!

عصمت چغتائی

دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑبڑایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ گھر کی مرغی دال برابر والا مضمون۔ گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا۔ یہ ادب نہیں پھکڑ، مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہوں گی۔ یعنی بے پڑھے رائے قائم، مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔ شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خودستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون ''یکہ'' نظر آیا۔ میں اور رحیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آ گئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے وہ ایک ہوشیار تھے۔ بولے لاؤ میں تمہیں سناؤں۔ اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہو گئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر ان کی زبانی۔ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔ جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے، تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں اور انہوں نے چھیڑا۔ لو ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہو گئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں اور بخدا وہ شخص جب کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز، کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے اس لیے جی جلتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہو گئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی

دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ افوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے ان کی رلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی نیلاہٹ لیے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت توڑے ہوئے ناہموار دانت اور لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک، دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آ گیا تھا۔ پتلی پتلی کھچی کھچی جیسی ٹانگیں جن کے سر پر ورم جیسے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں، کپڑوں، بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیوں کر ہنستا تھا، معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے، نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے خدا جبار و قہار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمہ کا عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون سا دنیا و دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا مگر پھر بھی نہ رلا سکا۔ اس دکھ میں جلن، ہنستے نہیں ہنساتے رہنا، کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے: زندہ لاش، خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جاندار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔ میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل۔ اس میں کتنی جان تھی۔ منہ پر گوشت نام کو نہ تھا۔ مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آ جانے سے چہرہ خوبصورت ہو گیا تھا۔ کنپٹی ابھر گئی تھیں۔ پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے۔ ایک موت کی سی جلا چہرہ پر آئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آ گئی تھی۔ جیسے حنوط کی ہوئی ممی، مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بے کس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آ جاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ خانم پڑھی، ہیرو وہ خود نہیں۔ ان میں اتنی جان ہی کب تھی مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں ناچتا کودتا، دوڑتا ہوا دیکھتا ہے ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔

شاید اوروں کے لیے خانم کچھ بھی نہیں۔ لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی سارے کریکٹر درست اور زندہ ہیں بھائی صاحب، بھائی جان، نانی اماں، شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھنگی بہشتی یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم ان کے لیے ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ہم ہلتے جلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابھی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔

''کھرپا بہادر'' جس کا پہلا ٹکڑا ''روح لطافت'' میں چھپا ہے یہ سب تخیلی ہے لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہان کی شرارتیں کروالیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمزاد چوریاں کرتا، شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا، مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیے نا جینے کے لیے!

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے۔ روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دلجوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہوگی؟ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی۔ غصہ بڑھتا مگر بے بس، سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انہیں بھی انسان سمجھے۔ انہیں بھی کوئی ڈانٹے انہیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان، چٹخارے لے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہوگئی۔ اچھا خاصہ گھر میدان جنگ بن گیا اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود، بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے اور کمزور و لاچار، ہر دم کا روگی، تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا اور کیا چاہیے؟ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا۔

لیکن مقصد تو یہ نہ تھا کہ واقعی دنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی سانپ جنا تھا میں نے!

مرنے سے پہلے قابل رحم حالت تھی بہن ہو کر نہیں انسان بن کر کہتی ہوں جی چاہتا تھا کہ جلدی سے مر چکیں۔ آنکھوں میں دم ہے مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذاب دوزخ بن گئے۔ ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اب بھیا سے کوئی پیار کرے، بیوی پوجا کرے، بچے محبت سے دیکھیں، بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجے سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی۔ مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے۔ ورم بڑھ گیا۔ آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا۔ اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی، انسان کس قدر پر ہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے، آج سے ۲۴ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا۔ وہ زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۰۲ اگست کو صبح

شمیم نے آ کر کہا۔ ''منے بھائی ختم ہو رہے ہیں اٹھو۔''

''وہ کبھی ختم نہ ہوں گے۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو۔'' میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

''ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں۔'' شمیم نے کچھ پریشان ہو کر ہلایا۔

''ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے۔ ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے۔'' میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں، لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ دو ننھے بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابھی انہیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھی۔ سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجہ سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

''منے بھائی'' میں نے ان پر جھک کر کہا۔ ایک لمحہ کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں، ہونٹ سکڑے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی۔ ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں۔ جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

''ختم ہو گئے منے بھائی.....'' نہ جانے کس نے کہا،

''وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔'' مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں ناممکن وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ ان کی جنگ اب بھی جاری ہے مرنے سے کیا ہوتا ہے میرے لیے تو وہ مر کر ہی جیے اور نہ جانے کتنوں کے لیے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے۔ اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کا پیغام ''دکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو، اور مر کر بھی لڑتے رہو،'' یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے۔ ان کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا، لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دکھ دیا، بچوں کو دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اگر دوزخ ایسے لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار ضرور دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تلخ طنز بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کی کھال کو کھا رہے ہوں گے۔ ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی۔ ملاؤں کے فتووں سے اس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرہ جا رہا ہوگا۔ مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی۔ نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہوں گے۔ مگر کوئی اسے رلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی۔ باہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی کولہے میں امرود برابر پھوڑا، آخری دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہو گئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے

آن پہنچیں۔ یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہیے، پتھر کا کلیجہ ہو مرتے وقت جملے کسنے کے لیے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد آئے۔ پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن بنا! آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان کی قینچی اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے خیالات بدل گئے ہیں ہم لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ ہمارا دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں سرمایہ داری سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی دکھی تھے۔ نادار، بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز، مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے۔ دکھ میں ٹھٹھا لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے زندگی کے ہر معاملے میں دکھ کو ہنس کر نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو اس سے دوستی، ''کھرپا بہادر'' میں جو ''شاہ لنکران'' کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اسی میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن، بہشتن، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے۔ ہزاروں قصے سنتے اور سناتے، وہی قصے ''سوانہ کی روحیں''، ''مہارانی کا خواب''، ''چمکی'' اور ''ریریڑے'' بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں بہت سی، بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چوں کہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات کو یقین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی خصوصاً ''کولتار'' تو بالکل ردی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی رنگ میں گڑبڑ کر کے لکھ دیا ہے۔ شریر بیوی تو بالکل فضول ہے مگر اپنے زمانے میں بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

''چمکی'' ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ! وہ ''چمکی'' کی خاموش نگاہوں کے پیغام۔ وہ ہیرو کا ان کی حرکتوں سے مسحور ہو جانا اور پھر خود مصنف کی زندگی۔ کس قدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا جو ان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا ہے۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں ''گل بکاؤلی''، ''زہرہ عشق'' وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انہیں پرانی کہہ دیا گیا۔ لیکن اب یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ پنڈلیوں کی گاؤدی، رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے وہ عورت کے جذبات تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے

تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔ ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ ''نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے جو کچھ لکھتے ہیں ''اماں کھانا'' معلوم ہوتا ہے۔'' یہ بھی کہا کرتے تھے کہ'' ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری، مصوری، قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی ''الف لیلہ'' کا رنگ غالب آ گیا۔

انہیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا۔ (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے۔ یہ عورت بہت پیارے جھوٹ بولتی ہے۔ انہیں شکایت تھی کہ میں بہت الٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں۔ میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں! اور ان کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں۔ اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً ''جھوٹ'' کہا کرتے تھے۔ جہاں انہوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے، پھر ''قصر صحرا'' لکھنے لگے۔ وہ ان کی گپوں کو ''قصر صحرا'' کہتے تھے عظیم بھائی کہتے، ''سرکار دنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔''

وہ یہ بھی کہتے کہ ''جنت اور دوزخ کا بیان'' بھی تو ''قصر صحرا'' ہے۔

اس پر ماموں کہتے:۔

''ارے زندہ لاشوں کو منع کرو یہ کفر ہے۔'' اس پر وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انہیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کہتے تھے ''دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے۔''

کہتے تھے ''میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر پجوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مزے سے آمدنی ہوتی۔''

انہیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں عقل چاہیے ان چیزوں کے لیے۔''

انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کا عموماً پیسے دے کر ڈھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انہیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے، اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔ جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لیے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن

نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مداح تھے اور امام حسینؑ کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے، ''میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؑ کھڑے ہیں، ادھر سے یزید لعین آیا، آپ کے پیر پکڑ لیے، گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اس دن سے یزید کی عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو ان کا ملاپ بھی ہو گیا، پھر ہم کیوں لڑیں۔''

سیاست سے کم دلچسپی تھی۔ کہتے تھے، ''بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔'' بہت سال ہوئے کچھ مضامین ''ریاست'' میں سیاسیات اور اکنامکس پر لکھے تھے وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا۔ مگر آخر میں بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے۔

''بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کروں گا۔ لہٰذا چپ ہی رہو۔''

پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے۔ ''یہ پرانی بات ہو گئی اب پردہ روکے نہیں رک سکتا۔ اس معاملہ میں ہم کر چکے۔ اب تو نئی پریشانیاں ہیں۔'' لوگ کہتے تھے دوزخ میں جاؤ گے، تو فرماتے، ''یہاں کون سی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا۔ کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں۔'' کبھی کہتے، ''اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے۔''

یہی وجہ ہے کہ سب انہیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں۔ وہ کہیں پر بھی جائیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے الجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ ''دوزخی'' کا کیا ٹھکانہ۔

شاہد احمد دہلوی

جگر مرادآبادی

بعض چہرے بڑے دھوکہ باز ہوتے ہیں۔

کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر الجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ چہرے کے رقبے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور منہ کسی قدر بڑا۔ کثرت پان خوری کے باعث منہ اگلدان، دانت شریفے کے بیج اور لب آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں پاؤں میں پیٹنٹ کی گرگابی، بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قد و قامت کا اٹاچی کیس۔ کوئی بتیس سال ادھر کا ذکر۔ جھانسی میں ایک صاحب سر جھکائے قدم بڑھائے اپنی دھن میں جھومتے چلے جا رہے تھے۔ میرے میزبان نے اشارے سے بتایا'' یہ ہیں جگر صاحب'' میں نے سنی ان سنی کر دی۔ ہونگے کوئی، میں نے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میرے میزبان نے کہا آج رات مشاعرہ ہے۔ آپ کو لے چلیں گے۔ میں نے کہا 'کسی اور برے کام میں وقت کیوں نہ ضائع کیا جائے؟ کوئی گویا ہو تو اس کا گانا سنا جائے۔' وکیل صاحب نے کہا 'اس کا بھی انتظام کیا ہے ہم نے کل ہم آپ کو یہاں کے ایک استاد کا گانا سنوائیں گے۔ مگر آج آپ مشاعرہ میں ضرور چلئے۔ جگر کا کلام آپ نے غالباً سنا نہیں ہے، سننے کے لائق ہے۔' میں نے جی میں کہا لو بھئی آج کی رات تو غارت ہوئی۔ قہر درویش بجان درویش: میزبان کی خواہش کا احترام بھی ضروری تھا طوعاً و کرہاً رات کو مشاعرے میں چلنے کی حامی بھر لی۔

پنڈال کشادہ بنایا گیا تھا اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اگلی صفوں میں ہمیں جگہ، پنڈال اُڑا کر رکھ دیا۔ کئی کئی دفع ایک ایک شعر کو پڑھوایا گیا۔ میں نے جگر سے پہلے اتنا سریلا شاعر اور کوئی نہیں سنا۔ یا پھر گانے والے شاعر سنے تھے جو باقاعدہ تان پلٹے کرتے تھے مثلاً حفیظ، ساغر، روش صدیقی وغیرہ۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ جگر صاحب کا پڑھنا ترنم ہی رہتا تھا گانا نہیں بنتا تھا۔ جگر صاحب کو اس مشاعرے میں سن کر میں بھی ان کے مداحوں میں شامل ہو گیا۔

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سواری باشد

میں 31ء 32ء میں حیدرآباد گیا تھا۔ واپسی میں دو دن کے لئے سید ابو محمد مرحوم کے ہاں بھوپال میں ٹھہرا تھا۔ سید صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ انہیں یوں پہچانئے کہ سید ابوالعلی مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ جگر صاحب اس زمانے میں بھوپال ہی میں تھے۔ خبر نہیں کہاں سے انہیں معلوم ہوا تیسرے پہر کو مجھ سے ملنے چلے آئے۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی بڑے خلوص و محبت سے گلے ملے۔ میری خیریت پوچھی۔ ساقی کی کیفیت دریافت کی خود ہی ساقی کے لئے اپنا کلام بھیجنے کا وعدہ کیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی ایک غزل لکھ کر دی۔ بڑے خوش خط تھے جگر صاحب۔ جو انداز پرانے زمانے کی وصلیوں کا ہوتا ہے اسی انداز میں یہ غزل قلم برداشتہ لکھی تھی مگر موتی جڑ دئے

تھے۔ اختتام پر اپنے نام کا طغرا بنا دیا تھا۔ مزاج کی نفاست زبان قلم سے بھی ٹپکتی تھی کتنی خوبصورتی چھپی ہوئی تھی اس ظاہرہ بدشکل انسان کے اندر! میری فرمائش پر غزل پڑھ کر بھی سنائی۔ نور کا گلا پایا تھا۔ اندھیرے میں سے روشنی کے پھوٹ رہی تھی۔ کیا آب حیواں کی طرح دنیا کی تمام بیش قیمت اور حسین چیزیں تاریکی ہی میں ہیں۔

میرے ہاں دلی کے آخری نرت کا استاد اللہ دئے خان آیا کرتے تھے۔ عمر ستر سے اوپر ہی تھی۔ سوکھ کر چمرخ ہو گئے تھے، دانت ٹوٹے ہوئے، گال پچکے ہوئے، بڑی گھنی سفید مونچھیں داڑھی مونڈھی ہوئی مگر بقول مرزا چیونٹیوں کے اللہ سے موجود رہتے۔ بصورت موجودہ کوئی استاد کو اپنے پاس بٹھانے تک کا روادار نہ ہوتا مگر جب وہ ٹھمری یا دادرے کا کوئی بول لگا کر بتاوا شروع کرتے تو یہ معلوم ہوتا تھا اندر کے ہے۔ اکھاڑے کی کوئی اپسرا اتر آئی ہے۔ اسی کریہہ منظر بوڑھے استاد کو گلے لگا لینے کو جی چاہنے لگتا۔ شاید فن کار کا فن ہمیشہ حسین و جوان رہتا ہے اور اس کی خوبصورت روح اس کے بدصورت جسم کی پردہ پوش ہو جاتی ہے۔ جگرؔ صاحب بھی جب اپنا کلام سناتے تو حسین نظر آنے لگتے۔

بھوپال کی مختصر ملاقات کے بعد جگرؔ صاحب سے اکثر ملنا ہوتا رہا۔ ان مختصر ملاقاتوں میں کبھی کبھی شعر و شاعری پر بھی بات چل نکلتی تو جگرؔ صاحب کیٹسؔ اور شیلےؔ تک کے نام لے جاتے۔ باتیں خاصی معقول کرتے تھے۔ اوچھے پن کی حرکتیں نہیں کرتے تھے اور نہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے تھے۔ ان کے مزاج کی شائستگی ان کی غزل میں ڈھل گئی تھی۔ ان سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی اور نہ بھی یہ سنا کہ کسی کو دھوکہ دیا یا کوئی بیہودہ بات کی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف النفس انسان تھے۔ کارڈینل نیومن نے GENTLEMAN جنٹل مین کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ کسی کو دکھ نہیں پہنچاتا۔ جگرؔ صاحب ایک GENTLEMAN PERFECT تھے۔

نیاز فتح پوری STUNTS کے قائل ہیں۔ وہ ہمیشہ چونکانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً آپ کہیں گے جنت اور دوزخ ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے۔ آپ کہیں گے خدا ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے۔ آپ کہیں گے قرآن شریف کلام اللہ تو کہیں کے کلام رسول ہے۔ آپ کہیں گے یہ دن ہے تو کہیں گے نہیں رات ہے۔ برنارڈ شاہ کے ایک کردار کی طرح اختلاف ضرور کریں گے۔ اس نے کہا بیٹھ جاؤ تو بولا ''نہیں میں کھڑا رہوں گا''، کہا ''اچھا تو کھڑے رہو'' ''نہیں میں بیٹھوں گا'' یہ کہہ کر بیٹھ گیا تو اس سے ملتی جلتی فطرت نیاز صاحب کی ہے حال ہی میں انہوں نے "نگار" کا جگرؔ نمبر شائع کیا ہے۔ جگرؔ کے انتقال پر ہندوستان اور پاکستان میں بہت سوگ منایا گیا۔ اور کئی رسالوں نے جگرؔ نمبر شائع کئے۔ نیاز صاحب بھلا ٹھنڈے پیٹوں تعریف و توصیف کے اس پشتارے کو کیسے گوارا کر لیتے۔ چنانچہ انہوں نے بھی ایک جگرؔ نمبر شائع کر دیا۔ جس میں سوائے جگرؔ کی برائی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس نمبر کا حشر تو وہی ہوگا جو آسمان پر تھوکنے کا۔ مجھے یہاں ایک واقعے کی وضاحت کرنی ہے جو اس نمبر میں درج کیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کراچی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت کے لئے جناب نیاز کو لکھنو سے بلوایا گیا تھا۔ کس نے بلایا تھا۔ اور کیوں بلایا تھا؟ اس کو اس وقت چھوڑیئے۔ نیازؔ صاحب نے لکھا ہے کہ انہیں کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جگرؔ صاحب کراچی میں موجود ہیں مگر انہوں نے نیازؔ صاحب کی صدارت میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ نیازؔ صاحب نے جگرؔ کے انکار کی وجہ ان کی تنقیدوں کو قرار دیا جو کبھی "نگار" میں انہوں نے کلام جگرؔ پر لکھی تھیں۔ مگر ہوا یہ کہ جگرؔ صاحب مشاعرے میں آئے۔ انہوں

نے کلام بھی سنایا اس واقعہ کو لکھ کر نیازؔ صاحب نے بتایا ہے کہ جگرؔ چونکہ پیسے لے کر پڑھتے تھے اس لئے وہ مشاعرے میں شرکت پر مجبور تھے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا پیسے لے کر پڑھنے والے شاعر کا کلام پھسپھسا ہوتا ہے۔ اسی مفروضہ پر نیازؔ صاحب نے اپنی جانب میں اس خاص نمبر میں کلام جگرؔ کے بخئے ادھیڑ دئے ہیں۔ مگر جب آپ ان کے اعتراضات پڑھیں گے تو آپ کو اس بوڑھے علامہ کے بچکانہ اعتراضات پر ہنسی آنے لگے گی۔ خیر یہ ایک الگ لغویت ہے جس سے محظوظ ہونے کے لئے اگر آپ وقت نکال سکتے ہوں تو نکال لیجئے۔ ہمیں تو صرف اس مشاعرے والے واقعے سے سروکار ہے۔ جگرؔ اتنے چھوٹے دل کے آدمی نہیں تھے کہ نیازؔ صاحب کی تنقید سے چراغ پا ہو جاتے اور سالہا سال تک ان سے دل میں بغض رکھتے۔ جگرؔ صاحب کا ساری عمر یہ عمل رہا کہ اپنے بدخواہوں کو معاف کر دیتے تھے۔ ان کے نزدیک یہی سب سے بڑی سزا تھی اس کے علاوہ اخلاقی اعتبار سے جگرؔ صاحب اتنے گرے ہوئے بھی نہیں تھے کہ کراچی کا مشاعرہ نہ پڑھتے تو ان کے ہاں فاقے پڑ جاتے۔ جگرؔ صاحب کراچی آ کر مہینوں رہتے تھے اور بغیر مشاعروں کے بھی رئیسوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے انہیں بیسیوں جگہ مفت پڑھتے سنا ہے۔ اس مشاعرے میں بھی پڑھتے وہ نیاز صاحب کی طرح پورا خرچہ لے کر ہندوستان سے کراچی نہیں آئے تھے بلکہ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ اور ان کا مشاعرے میں شریک ہو جانا ہی نیازؔ صاحب کے بہتان کی تردید کے لئے کافی ہے۔ جگرؔ صاحب ایک شریف النفس انسان تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا کسی کو دکھ نہیں پہنچاتے تھے۔ جگرؔ صاحب ایک سیر چشم آدمی تھے۔ روپیہ پیسہ ان کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے ان کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہ شراب کے نشے میں دھت رہا کرتے تھے اور کوڑی کوڑی کو محتاج۔ مگر میں نے آج تک کسی سے نہیں سنا کہ جگرؔ صاحب نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا ہو۔ مدہوشی میں بھی انہوں نے اپنی غیرت و خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

نخشبؔ جارچوی نے جگرؔ صاحب کا ایک واقعہ نایا تھا کہ کسی فلم کے لئے جگرؔ صاحب کی ایک غزل ریکارڈ کرنی تھی، جگرؔ صاحب کو اس کا معاوضہ ٹھیک یاد نہیں رہا، پانچ ہزار یا آٹھ ہزار پیشگی دے دیا گیا۔ جگرؔ صاحب اس سے پہلے ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے اپنا کلام نشر بھی کر چکے تھے اور ریکارڈ بھی کرا چکے تھے۔ لہٰذا نہایت اطمینان سے فلم کے لئے بھی اپنی ریکارڈنگ کرانے کے لئے بیٹھ گئے مگر جب اپنا ریکارڈ خود سنا تو سٹ پٹا گئے اور اسے ناپسند کر کے دوبارہ ریکارڈ کیا۔ مگر اس دفعہ بھی انہیں اپنا ریکارڈ نہایت بے سرا معلوم ہوا۔ تیسری دفعہ اور چوتھی دفعہ بھی ناکام رہے۔ غرض چھ دفعہ یہی ماجرا پیش آیا۔ سخت بددل ہوئے، کمپنی والوں نے کہا ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے آپ اب کل پھر تشریف لائیے۔'' گھر پہنچ کر نخشب سے بولے ''خدا جانے کیا بات ہے کہ ریکارڈ اچھا نہیں بن رہا تم ایسا کرو یہ روپیہ واپس کر دو اور مجھے آج سوار کرا دو۔'' نخشب صاحب نے انہیں تسلی دی اور ایک دن کے لئے انہیں روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگلے دن بھی کئی ریکارڈ لئے مگر سب ناقص رہے۔ جگرؔ صاحب کی پریشانی اور شرمندگی بڑھتی جا رہی تھی اور ریکارڈنگ بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی نخشب صاحب کو ایک ترکیب سوجھی مائکروفون ان کے سامنے سے ہٹایا اور بولے ''کچھ دیری توقف کیجئے، چائے وائے پیجئے، پھر دیکھا جائے گا۔'' جگرؔ صاحب نے جھنجھلا کر کہا ''میاں تم ان کا روپیہ واپس کرو اور مجھے گھر جانے دو۔'' انہوں نے کہا ''بہت اچھا روپیہ واپس کر دیا جائے گا۔ مگر آپ اطمینان سے بیٹھ کر چائے تو پی لیجئے۔'' جگرؔ صاحب خوش ہو گئے جیسے منوں بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔ ادھر ادھر کی باتیں ہنس

ہنس کر کرنے لگے۔ چائے پی چکے تو نخشبؔ نے کہا'' دراصل آپ کو مائکروفون کا احساس ہو جاتا ہے اب اگر آپ پڑھیں گے تو بالکل ٹھیک پڑھیں گے۔ ذرا پڑھئے تو۔'' جگرؔ صاحب پڑھنے لگے، جب پڑھ چکے تو اس کا ریکارڈ انہیں سنایا گیا۔ حیران ہو کر بولے'' یہ کونسا ریکارڈ ہے، یہ تو ٹھیک ہے۔'' نخشب نے بتایا کہ'' ابھی جو آپ پڑھ رہے تھے اس کا ریکارڈ ہے۔'' مگر کب اور کیسے ریکارڈ کر لیا۔'' جی یہ ہمارے Tricks of the trade ہیں۔ اب گھر چلئے، روپیہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔''

جس شخص کا یہ کردار ہو وہ پیسے کا میت کیسے ہو سکتا ہے۔ جب وہ پانچ ہزار سے دست کش ہو سکتا ہے تو کیا پانچ سو کے مشاعرے کو نہیں چھوڑ سکتا؟ وہ مشاعرے میں روپے کے لئے نہیں بلکہ اس لئے شریک ہوئے کہ ان کی عدم شرکت سے مشاعرے کے کارکنوں کے ساتھ سامعین کی بھی دل آزاری ہوتی اور خود جناب نیازؔ کو خفت اٹھانی پڑتی۔ جگرؔ صاحب کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی وہ کسی نے ہاتھ اٹھا کر خیرات میں انہیں نہیں دی تھی۔ ادب دوستوں نے انہیں رئیس المتغزلین قرار دیا تھا۔ اگر انہیں شہنشاہِ تغزل کہا گیا (یہ نیاز صاحب کا ہی بیان ہے) تو شہنشاہیت کا تاج بھی خاصان ادب ہی نے ان کے سر پر رکھا ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ جگرؔ صاحب محسود تھے، حاسد نہیں تھے۔ شریف آدمی حاسد نہیں ہوتے۔

جگرؔ صاحب'' شعلہ طور'' کی اشاعت سے پہلے بھی شاعر تھے اور ان کا ایک مجموعہ کلام شائع ہو کر گمنام ہو چکا تھا۔ اس زمانے کے کلام میں بھی تیکھا پن تھا مگر سنا ہے کہ کسی معرکہ عشق میں ناکام ہونے کے بعد ان کے ساتھ ان کے کلام کی بھی دنیا بدل گئی۔ جگرؔ کی غزل میں جو نیا مزاج پایا جاتا ہے وہ اسی محرومی کا نتیجہ ہے۔ عشق کی آگ بھڑک کر شعلہ طور بن گئی۔'' شعلہ طور'' کا پہلا ایڈیشن چھپتے ہی ختم ہو گیا۔ سید سلیمان ندری مرحوم نے شاعر اور کلام شاعر کا تعارف کرایا تھا۔ میرے پاس جب یہ نسخہ ریویو کے لئے آیا تو میں نے اور انصار ناصری نے جگرؔ ہی کی دھنوں میں لہک لہک کر پوری ایک رات اسے ختم کرنے میں صرف کر دی تھی۔ اس ایڈیشن میں اویاؔما کا بنایا ہوا جگرؔ کا ایک پنسل اسکیچ بھی تھا جو اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ ہم اسے کسی غیر ملکی آرٹسٹ کا کارنامہ سمجھتے رہے۔ بعد میں جامعہ ملیہ میں اویاؔما سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہی ملک کا ایک دھان پان سا نوجوان ہے جس کے دل میں آگ بھری ہوئی ہے۔ دو چار دفعہ کی ملاقات کے بعد جب اس سے پوچھا کہ یہ آپ نے اپنا نام کیا رکھا ہے تو اس نے بتایا کہ اویاؔما جاپانی زبان میں جوالا مکھی کو کہتے ہیں۔ پراسرار سا آدمی تھا۔ دلی سے غائب ہو گیا۔ پھر سنا کہ مر گیا۔

جگرؔ صاحب ایک زمانے میں مچھلی کی طرح شراب پیتے تھے۔ ان کے قدردانوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا تھا کہ جب ان کا کلام سننا ہوتا تو ان کے لئے ایک بوتل منگا لیتے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا۔ گھنٹوں اپنا کلام سناتے رہتے۔ پھر ان کا لپکا اتنا زیادہ ہو گیا کہ ہر وقت پینے لگے۔ جگرؔ صاحب کی زندگی کا یہ دور ثقہ حضرات کے نزدیک خاصا قابل اعتراض تھا۔ مگر مدہوشی کا یہی دور ان کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ ان کے قدردان اور مشاعرے والے جام مے کی مانند انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ روپیہ ان پر برستا تھا۔ مگر وہ کل کے لئے آج شراب میں خست نہیں کرتے تھے۔ روپیہ ادھر آیا اور اُدھر شراب بن کر اڑا۔ خبر نہیں گھر کی زندگی اس شراب نوشی کی وجہ سے اجڑی یا گھر کی اجڑی ہوئی زندگی نے کثرت مے نوشی کے پر لگائے دنوں مہینوں گھر کا رخ نہ کرتے۔ آج اس کے ہاں ٹھہرے ہیں کل اس کے

ہاں۔اصغؔر گونڈوی ان کے بڑے ہم زلف تھے۔جب انہوں نے میاں بیوی میں نا اتفاقی کی یہ صورت دیکھی تو جگؔر سے کہا کہ اپنے ساتھ بیوی کی زندگی کیوں خراب کررہے ہو؟ طلاق دے دو۔اصغؔر کا جگؔر صاحب بہت ادب کرتے تھے۔تعمیل ارشاد میں طلاق دے دی۔شراب اور بھی بڑھ گئی۔اتنی کہ مشاعروں کے اسٹیج پر بھی بوتل اور گلاس رہنے لگا۔غزل پڑھتے پڑھتے بھول جاتے اور سامعین خاصے بے لطف ہوتے۔مگران کے کلام اوران کے کمال کی وجہ سے ان کی اس لغویت کونظر انداز کردیتے۔کچھ رسم ایسی پڑ گئی تھی کہ بغیر جگؔر کے کوئی مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا تھا۔میں نے بہت سے ذہین شاعروں کوشراب سے تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے۔اخؔتر شیرانی، میراجؔی اور مجؔاز کا آخر میں یہ حال ہوگیا تھا کہ اسٹیج پر نہ صرف قے کردیتے تھے بلکہ پیشاب بھی کردیتے تھےاورلوگ انہیں اٹھا کران کے ٹھکانوں پر پہنچایا کرتے تھے۔ جگؔر صاحب اتنے نہیں گرے تھے انہیں پھر بھی ہوش رہتا تھااوران کی طرح اول فول بکنے نہیں لگتے تھے۔اُن لوگوں میں اور بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں جن کی وجہ سے لوگ ان سے بھاگنے لگے تھے۔جگؔر صاحب نے کسی کی بہو بیٹی کونہیں تاکا کسی سے بھیک نہیں مانگی، تانگے والوں اور چکلے والوں سے انہیں لڑتے ہوئے نہیں دیکھا اور پیٹتے ہوئے کبھی نہیں پائے گئے۔ان کی شراب خوری کے نقصانات انہی کی ذات تک محدود تھے۔دوسروں کوان کا خمیازہ بھگتنا نہیں پڑا تھا۔اوروں کی شاعری دم توڑتی چلی گئی۔جگؔر کی شاعری توانا ہے توانا تر ہوتی چلی گئی۔اپنے اپنے ظرف کی بات ہے جگؔر کی شرافتِ نفس میں فرق نہیں آیااوراسی وجہ سے ان کی نفاستِ شاعری بھی قائم رہی۔

اصغؔر صاحب کی بیوی کا جب انتقال ہوگیا توانہوں نے اپنی سالی یعنی جگؔر کی مطلقہ سے شادی کرلی۔یوں دواجڑے گھر بس گئے۔ جگؔر صاحب نے اس نئے رشتے پر برہمی کا مطلق اظہار نہیں کیا۔بلکہ اصغؔر صاحب سے ان کی محبت اورعقیدت کچھ اور بڑھ ہی گئی۔یارلوگوں نے اس واقعہ کے افسانے تراش لئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جگؔر صاحب نے اصغؔر کے ساتھ ان کی بیوی کی عزت وتکریم بھی شروع کردی۔وہی ناپسندیدہ بیوی اب ان کے لئے ایک لائق احترام خاتون بن گئی تھیں۔اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ جگؔر صاحب حفظ مراتب کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

کچھ عرصہ ہوااصغؔر گونڈوی کا انتقال ہوگیا۔جگؔر صاحب کو بڑا رنج پہنچا۔ان کی زندگی میں ایک زبردست انقلابی نقطہ تھا۔سنا کے جگؔر صاحب بہت بیمار ہیں، اتنے کہ مشاعروں میں شرکت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ان کی بیماری تھی ترکِ شراب۔سنا تھا کہ یہ منہ لگ جائے تو پھر نہیں چھوٹتی۔مگر جگؔر نے یک لخت شراب چھوڑ دی۔ان کے دل کی حالت بگڑ گئی۔طبیبوں نے بہت کہا کہ رفتہ رفتہ کم کرکے چھوڑ دو ورنہ مرجاؤ گے۔مگر جگؔر صاحب بڑے مضبوط کردار کے آدمی تھے انہوں نے کہا ''جب چھوڑنی ہی ٹھہری تو بس چھوڑ دی۔اب جان جائے یار ہے۔'' اس کا ردعمل اتنا شدید ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔جگؔر صاحب نے اپنے آپ اتنی سخت آزمائش میں آخر کیوں مبتلا کیا، معلوم ہوا کہ یہ بھی محبت کی کارفرمائی ہے۔اصغؔر صاحب کے انتقال کے بعد جگؔر صاحب کوان کی بیوہ اوراپنی سابقہ بیوی سے محبت ہوگئی۔عدت پوری ہونے کے بعد حرف مطلب زبان پر لائے۔انہوں نے فرمایا ''شراب چھوڑ دو'' اس اللہ کے بندے نے شراب چھوڑ دی۔بڑی بری بری حالتیں ہوئیں مگر نیت نیک تھی۔ساحل مراد پر زندہ ہی پہنچ گئے۔انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔شادی کے بعد جگؔر صاحب نے ایک نئی زندگی کا

آغاز کیا رندی سرمستی رخصت ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک زاہد خشک بن گئے تھے مگر اس زہد و اتقا میں ان کا دل زندہ مرنے نہیں پایا تھا۔ طبیعت کی مستقل خرابی کے باوجود وہ خوب ہنستے بولتے تھے۔ گھنٹوں برج کھیلا کرتے تھے۔ مشاعروں ادبی محفلوں اور دوستوں کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اخلاق اور بھی نکھر گیا تھا۔ کھانا وہ پہلے بھی کم کھاتے تھے اب تو لوں ماشوں پر آ گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بیوی سلیقہ مند خاتون تھیں۔ چند سال کے پھیر میں ہی مشاعروں کے روپئے سیسنا ہے کہ انہوں نے جگر صاحب کو صاحب جائیداد بنا دیا۔ قیام پاکستان کے بعد جگر صاحب نے یو پی کے مسلمانوں کے لئے بہت مفید کام کئے۔ حکام ان کی عزت کرتے تھے اور ان کی بات نہیں ٹالتے تھے۔ پاکستان میں بھی ان کا وقار قائم تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی شاعری بھی بہتر ہو گئی تھی مگر اس میں جو ایک قسم کی بے ساختگی اور ایک طرح کی والہانہ کیفیت تھی، ایک اچھوتا بانکپن تھا وہ یقیناً نہیں رہا تھا۔ اس کے بدلے سنجیدگی اور روحانی بالیدگی در آئی تھی۔ پہلے دل سے شعر کہتے تھے اب دماغ سے کہنے لگے تھے۔

ببیں کرامتِ بت خانہ مرا اے شیخ

کہ چون خراب شود خانۂ خدا گردد

دل کی بیماری نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا آہستہ آہستہ جگر صاحب کی صحت جواب دیتی چلی گئی۔ دو سال ہوئے کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، ویسے ہی ہشاش بشاش تھے۔ اور اسی گرم جوشی سے ملے تھے۔ اسی طرح پوری آواز سے اپنا کلام سناتے تھے۔ لوگ فرمائش کر کر کے ان سے ان کا کلام سنتے تھے۔ خوش ہو کر سناتے تھے۔ ایک مشاعرے میں دور پیچھے سے آواز آئی ''جگر صاحب وہ سنایئے جس میں ہرن ٹیل رہے ہیں۔'' یعنی ٹہل رہے ہیں۔ جگر صاحب نے مسکرا کر اپنا مشہور فارسی کا سراپا سنا دیا جس میں ''آہو خرامے'' آتا ہے۔ وطن واپس پہنچے تو دل کے شدید دورے پڑنے لگے۔ صاحبِ فراش ہو گئے مہینوں زندگی اور موت میں ان پر چھینا جھپٹی ہوتی رہی اسی بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا؛

خدا رحمتِ کند ایں عاشقان پاک طینت را

مفتی ثناءاللہ محمود

حضرت اسماء بنت ابوبکر

نام نسب:

نام اسماء بنت ابوبکرؓ آپ ہجرت سے ستائیس سال قبل مکہ میں پیدا ہوئیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے گھر میں ان کی پاکیزہ پرورش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل اور سلیقہ مندی عطا کی تھی، اس لئے وہ فطری اخلاق سے مزین تھیں۔ آپ ہجرت سے بہت پہلے ایمان لے آئی تھیں۔ آپ کا شمار سابقین الاولین میں ہوتا ہے۔ ایمان والوں کی فہرست میں آپ کا نمبر ۱۸ ہے۔

ذات النطاقین:

جب ہجرت کا موقع آیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت محمدؐ کے ساتھ ہجرت کے لئے نکلے تو اس بات کا علم سوائے حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آل کے کسی کو نہ تھا۔ بالآخر آنحضورؐ ہجرت فرما گئے اور اسی ہجرت میں اسماء بنت ابوبکرؓ کو یہ لقب ''ذات النطاقین'' یعنی دو کمر بند والی حاصل ہوا۔ اس لقب نے ان کی زندگی میں بڑی پاکیزہ یادیں اور اعزازات چھوڑے۔ کتب حدیث میں لکھا ہے کہ جب حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ نے دونوں مہاجر شخصیات کا کھانا تیار کیا تو اسے لے جانے کے لئے ایک چمڑے کے تھیلے میں ڈال دیا، مگر اسے بند کرنے کے لئے کچھ نہ ملا تو انہوں نے اپنے کمر بند کے دو ٹکڑے کئے اور ایک سے اس تھیلے کا منہ بند کر دیا۔ آپ کے اس عمل نے یہ بتا دیا کہ آپ خطرات سے نہ ڈرنے والی اور نہ بھاگنے والی خاتون تھیں، بلکہ آپ بڑی جرأت مند، مضبوط دل اور قوی اعصاب کی مالک تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے رات کے اندھیرے میں کھانے کی اشیاء اٹھائے، دشوار گزار طویل سفر طے کر کے پہاڑ پر چڑھ کر غار ثور تک پہنچیں۔ حالاں کہ راستے میں دشمن مشرکین و کفار ان دونوں حضرات کو تلاش کر رہے تھے۔ جب آپ غار ثور پہنچیں اور تمام حالات بتائے تو آنحضورؐ نے آپ کو جنت کی خوشخبری دی اور ذات النطاقین کا لقب عطا فرمایا۔

اس کے بعد حضرت اسماء اور آپ کا پورا خاندان ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیر آپ کے بطن میں تھے اور وہاں جا کر ان کی پیدائش ہوئی تو مسلمانوں نے ایک زوردار نعرہ تکبیر لگایا، کیوں کہ یہودیوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ اب مسلمانوں کے کوئی اولاد پیدا نہ ہوگی، مگر جب حضرت اسماء کے ہاں اولاد ہوئی تو مسلمانوں نے نعرہ بلند کیا، یہ یہود کی تکذیب کا نعرہ تھا۔

صبر و شکر کی پیکر حضرت اسماءؓ:

حضرت اسماءؓ نے صبر و شکر کی بہترین مثال قائم کی اور یہ دونوں صفات اہلیان جنت کی ہیں۔ حضرت اسماءؓ خود بیان فرماتی ہیں کہ حضرت زبیرؓ سے جب میرا نکاح ہوا تو ان کے پاس صرف ایک گھوڑا اور کچھ چیزیں تھیں، تو میں ان کا بہت خیال کرتی تھی۔ ان کے گھوڑے کو چارہ وغیرہ ڈالتی، اس کے لئے گٹھلیاں کوٹتی پانی لاتی اور انہیں بھگوتی۔ اور یہ گٹھلیاں میں حضرت زبیر کی زمین سے جو رسول اللہؐ نے دی

تھی ڈھونڈ کر لاتی تھی، اور سر پر رکھ کر لاتی تھی۔ یہ زمین تین فرسخ دور تھی۔ ایک مرتبہ میں گٹھلیاں سر پر رکھ کر لا رہی تھی تو رسول اللہؐ سے راستے میں ملاقات ہوگئی۔ آپؐ کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ آپؐ اونٹنی پر سوار تھے۔ آپؐ نے ''اخ اخ'' کہہ کر اونٹنی کو بٹھایا تا کہ میں اونٹ پر آپ کے پیچھے سوار ہو جاؤں۔ مجھے شرم آئی اور مجھے زبیر کی حیا و غیرت یاد آئی۔ فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہؐ چلے گئے۔

پھر جب زبیرؓ گھر آئے تو میں نے واقعہ انہیں بتایا۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا یہ گٹھلیاں لانا مجھے ان کے ساتھ سوار ہونے سے زیادہ گراں لگتا ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک خادم بھیج دیا جس سے مجھے گھوڑے کی دیکھ بھال سے چھٹی مل گئی، گویا انہوں نے مجھے آزاد کر دیا۔

خاندانی سخی خاتون:

حضرت اسماءؓ خواتین میں سخاوت کے اعتبار سے بڑی مشہور تھیں۔ وہ اپنے گھر والوں کو اور صاحب زادیوں سے کہا کرتی تھیں کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور صدقہ کرو، بچت کو نہ دیکھو، اگر تم فاضل مال کو دیکھو گی تو کوئی فضیلت نہیں ملے گی اور اگر صدقہ کرتی رہو گی تو کبھی مال کو کم نہیں پاؤ گی۔ حضرت محمد بن منکدرؒ کہتے ہیں کہ یہ حقیقی سخی خاتون تھیں اور انہوں نے یہ حدیث بھی بیان کی ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت اسماءؓ سے فرمایا تھا کہ ''اپنی سخاوت کو کبھی باندھنا نہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں باندھ دیں گے۔'' مطلب یہ تھا کہ اپنے پاس ذخیرہ نہ کرنا اور ہاتھ میں جو کچھ ہو اسے روکنا نہیں ورنہ رزق اترنا بند ہو جائے گا۔ حضرت اسماءؓ اس بلند درجہ سخی خاتون تھیں کہ سخاوت میں ضرب المثل سمجھی جاتی تھیں۔ روایت ہے کہ جب آپ بیمار ہوتیں تو تمام غلام آزاد فرما دیا کرتی تھیں۔

حضرت اسماءؓ کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ سے زیادہ کوئی سخی نہیں دیکھا، دونوں کی سخاوت کا انداز بھی الگ الگ تھا۔''

قرآن فہم خاتون:

حضرت اسماءؓ کے معانی قرآن کے فہم اور ان کی بلاغت پر کوئی تعجب نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے گھر پیدا ہوئی تھیں۔ حضرت اسماءؓ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والی اور قرآن سمجھنے والی خاتون تھیں، اور خواتین میں ایک بہترین نمونہ تھیں۔ آپ کے شوہر خود فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں گھر میں داخل ہوا تو آپ نماز پڑھ رہی تھیں اور اس میں آپ نے یہ آیت تلاوت کی کہ ترجمہ: (اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا کہ ہمیں جھلسنے والے عذاب سے بچایا) تو یہ آگ سے پناہ مانگنے لگیں میں کھڑا ہو گیا اور یہ مسلسل جہنم سے پناہ مانگتی رہیں، پھر میں بازار چلا گیا اور بازار سے لوٹا تو دیکھا کہ آپ اس وقت بھی جہنم سے پناہ مانگ رہی تھیں اور مسلسل رو رہی تھیں۔ حضرت اسماءؓ صرف قرآن فہم ہی نہیں بلکہ ایک مستند محدثہ بھی تھیں۔ آپ کو رسول اللہؐ سے براہ راست روایت حاصل تھیں۔ آپ سے پچاسی کی تعداد میں روایات مروی ہیں۔ آپ سے کئی صحابہ اور تابعین روایت کرتے تھے۔

حجاج بن یوسف کے مقابلے میں شہید کی ماں:

حضرت اسماءؓ نے سو سال عمر پائی۔ آخر زمانے میں آپ کے بیٹے عبداللہ بن زبیر کی حکومت تھی جو یمن، حجاز، عراق اور خراسان تک

پھیلی ہوئی تھی مگر مشکل میں رہی۔حجاج بن یوسف کی فوج نے مکہ

مکرمہ کا گھیراؤ کرلیا اور منجنیق سے پتھراؤ کیا۔امان طلب کرنے یا راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنی والدہ سے مشورہ کیا۔آپ اس عمر میں بھی بڑی عقل اور حکمت والی خاتون تھیں۔عظیم ماں نے جواب دیا، بیٹا عزت سے جیو اور عزت سے مرو تیری قوم تجھے قید نہ کر سکے گی۔بالآخر حضرت عبداللہ شہید ہوئے تو حجاج بن یوسف کے ساتھیوں نے نعرہ لگایا تو حضرت اسماءؓ نے کہا کہ میرے بیٹے کی پیدائش پر نعرہ لگانے والے اس کی شہادت پر نعرہ لگانے والوں سے بہت بہتر لوگ تھے۔حجاج بن یوسف، حضرت اسماءؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تیرے بیٹے نے بیت اللہ میں الحاد بپا کیا تھا۔اللہ نے اسے دردناک عذاب چکھا دیا۔تو حضرت اسماءؓ نے فرمایا: تو جھوٹ بولتا ہے وہ اپنی والدہ سے نیک سلوک کرتا تھا، روزے رکھتا تھا اور راتوں کو اللہ کے سامنے کھڑا رہتا تھا اور ہمیں رسول اللہؐ نے بتایا تھا:

''بنوثقیف (جو کہ حجاج کا قبیلہ تھا) سے دو کذاب نکلیں گے، دوسرا ان میں سے پہلے سے زیادہ برا ہوگا اور وہ قتل عام کرے گا۔''

تو حجاج بن یوسف جواب دئے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

حضرت اسماء کے اعزازات:

حضرت اسماءؓ ایک زاہدہ و عابدہ خاتون ہونے کے علاوہ ایک محدثہ اور کئی کارناموں کی مالک خاتون تھیں۔علم تعبیر کی ماہر تھیں، انتہائی فصیح اللسان اور حاضر دماغ تھیں۔ان کا حضرت زبیرؓ کی یاد میں ایک شاندار قصیدہ ہے جو ان کی بلاغت کی نشاندہی کرتا ہے۔حضرت اسماءؓ کو جو گھرانہ ملا وہ اس عالم کا بہترین گھرانہ تھا۔

۱۔ ان کے شوہر زبیرؓ بن عوام تھے جو رسول اللہؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

۲۔ ان کی سسرال میں افضل البشر خاتم الانبیا بھی تھے۔

۳۔ ان کی باپ شریک بہن عائشہ صدیقہ ام المومنین تھیں۔

۴۔ ان کے والد محترم رسول اللہؐ کے رفیق، محبوب اور سسر حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو اول خلیفہ راشد اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔

۵۔ ان کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیر خلیفۂ اسلام امیر المومنین تھے۔جنہوں نے آٹھ سال بلا مزاحمت اور چار سال مزاحمت و بغاوت کا سامنا کرتے ہوئے عالم اسلام پر حکومت کی اور بالآخر خلافت بنوامیہ کے بانی مروان بن حکم کی فوجوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔اس وقت تک مروان بھی مر چکا تھا۔

۶۔ ان کے سگے بھائی عبداللہ بن ابوبکر ایک مشہور صحابی، بڑے سخی، بڑے عقلمند اور بہادر سپاہی تھے۔ان کے تعلق سے مشہور ہے کہ صحابہ میں خلفائے راشدین کے بعد جن چار عبداللہ کو اسلام کے ستون کہا جاتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔

۷۔ حضرت اسماء کو شہدا کی ماں ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔حضرت زبیرؓ کے آٹھ بیٹے تھے اور انہوں نے آٹھوں بیٹوں کے

نام شہدائے بدر کے ناموں میں رکھے اور خواہش کی کہ اللہ تعالی ان تمام کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے۔ ان کی یہ خواہش پوری ہوئی اور آٹھوں بیٹے میدان جہاد میں شہید ہوئے۔

۸۔ ان کے والد کی چار پشتیں صحابی گزریں، ان کے شوہر عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

۹۔ رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے ان کے شوہر، بہن اور والد کو جنت کی خوش خبری ملی۔

۱۰۔ خواتین صحابیات میں طویل عمر خاتون تھیں۔ سو سال کی عمر پائی آخر عمر تک حواس سلامت تھے۔ حتی کہ دانت بھی نہیں گرے تھے۔ مہاجرین صحابہ وصحابیات میں سب سے آخر میں وفات پانے والی شخصیت حضرت اسماء بنت ابوبکر تھیں۔

۱۱۔ جہاد میں حصہ لیا۔ جنگ یرموک میں شاندار کردار ادا کیا۔

۱۲۔ ان کے پاس رسول اللہؐ کا پہنا ہوا ایک جبہ تھا جسے یہ دھو کر اس کا پانی مریضوں کو پلاتی تھیں جس سے وہ شفایاب ہوتے تھے۔

آخری لمحات:

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد جب انہیں اطلاع ملی کہ امیر المومنین حضرت عبداللہ بن زبیر کی نعش کو لٹکا دیا گیا ہے تو آپ نے دعا کی ''اے اللہ مجھے اس وقت تک موت نہ دے جب تک مجھے میرا بیٹا نہ دے دیا جائے تو پھر میں اپنے ہاتھ سے عبداللہ کو نہلا دھلا کر کفن دوں۔'' جب نعش ملی تو حضرت اسماء نے خود ابن زبیرؓ کو خوشبو لگائی اور کفن دیا اور ان کی نماز جنازہ بھی پڑھی اور پھر اسی ہفتہ میں جمعہ کے دن سے پہلے پہلے ہی ان کی وفات ہوگئی۔ یہ سنہ ۷۳ ھجری تھا۔

محمد رفیع سوداؔ

قصیدہ در نعت

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زُنّارِ تسبیحِ سلیمانی

ہُنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا
نہ ہو جوں تیغ بے جوہر، وگرنہ ننگ عریانی

فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہِ دل ہووے
نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل، جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی؟
نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں، شاہوں کی پیشانی

عروجِ دستِ ہمت کو نہیں ہے قدر بیش و کم (۵)
سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زر افشانی

کرے ہے کلفتِ ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلود، کم جاتی ہے پہچانی

اکیلا ہو کے رہ دنیا میں، چاہے گر بہت جینا
ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے، عمرِ خضر طولانی

اذیت وصل میں دونی، جدائی سے ہو عاشق کو
بہت رہتا ہے نالاں، فصلِ گل میں، مرغِ بستانی

موقر جان اربابِ ہنر کو، بے لباسی میں
کہ ہو جو تیغ با جوہر، اسے عزت ہے عریانی

بہ رنگِ کوہ رہ خاموش، حرفِ ناسزا سن کر (۱۰)
کہ تا بد گو، صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی

نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا
نفس جب تک ہے، داغِ دل سے، فرصت کیوں کرے پانی

یہ روشن ہے بہ رنگِ شمع ربطِ یاد و آتش سے
موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمنِ جانی

کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو
کہ زیبِ ترکِ چشمِ یار سرمہ ہے صفاہائی

طلوعِ مہر ہو پامال حیرت آسماں اوپر
لکھوں بہرِ غزل گر اس زمیں میں مطلعِ ثانی

مطلعِ ثانی

عجب ناداں ہیں وہ، جن کو ہے عجب تاجِ سلطانی (۱۵)
فلک، بالِ ہما کو، پل میں سونپے ہے مگس رانی

نہیں معلوم، ان نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا؟
کہ چشمِ نقشِ پا سے تا عدم، نکلی نہ حیرانی

ہماری آہ، دلِ تیرا نہ نرما دے، تو یا قسمت!
وگرنہ دیکھ آئینہ، کہ پتھر ہو گئے پانی

تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا
کہ ہے جمعیت خاطر مجھے، ان کی پریشانی

زمانے میں نہیں کھلتا ہے کارِ بستہ، حیراں ہوں
گرہ غنچوں کی کھولے ہے صبا، کیوں کر بہ آسانی

جنوں کے ہاتھ سے، سرتا قدم کاہیدہ اتنا ہوں (۲۰)
کہ اعضا، دیدہ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی

نہ رکھا جگ میں رسم دوستی، اندوہ روزی نے
مگر زانو سے اب باقی رہا ہے ربط پیشانی

سیہ بختی میں، اے سوداؔ نہیں طولِ سخن لازم
نمط خامے کے، سر کٹوائے گی ایسی زباں دانی

سمجھ اے ناقباحت فہم! کب تک یہ بیاں ہوگا
ادائے چین پیشانی ولطف زلف طولانی

خدا کے واسطے باز آ تو، اب ملنے سے خوباں کے
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل ان کی چشم وزلف کے اوپر (۲۵)
مگر بیمار ہووے ضعف یا کھینچے پریشانی

نکال اس کفر کو دل سے، کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے، تکلیفِ مسلمانی

زہے دینِ محمدؐ! پیروی میں اس کی جو ہوویں
زہے! خاکِ قدم سے اُن کی چشم عرش نورانی

ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو، گر اس کی
امانت دارِ نورِ احمدی، ہوتی نہ پیشانی

اسی کو آدم وحوا کی خلقت سے کیا پیدا
مراد الفاظ سے معنی ہے تا آیات قرآنی

خیال خلق گر اس کا، گر شفیع کافراں ہووے (۳۰)
رکھیں بخشش کے سرِ منت، یہودی اور نصرانی

زباں پر اس کی گزرے حرف جس جا گہ شفاعت کا
کرے واں ناز آمرزش پہ ہر یک فاسق وزانی

رکھا جب سے قدم مسند پہ آن نے شریعت کی
کرے ہے موج بحر معدلت تب سے یہ طغیانی

اگر نقصان پرخس کے شرر کا ٹک ارادہ ہو
کرے کو آگ کے دو ہیں کرے غرق آن کر پانی

موافق گر نہ کرتا عدل اس کا آب وآتش کو
تو کوئی سنگ سے بندھتی تھی شکل لعل رمانی

یہ کیا انصاف ہے یارب کہ طیر ووحش تک جگ میں
اس امن وعیش سے اپنی بسر اوقات لے جانی

پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا
شباں نے گرگ کو گلے کی سونپی ہے نگہ بانی

ہما آسا ہے پرداز ملخ اوج سعادت پر
کرے ہے مور چڑھ کر سینہ دد پر سلیمانی

کھلے ہیں غنچہ گل باغ میں خاطر سے بلبل کی
جواب اوراق جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی

جہاں انصاف سے ہر گاہ اب معمور ہے اتنا
تو اس کے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی

ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اس وقت دنیا میں
وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

نہ ہونے سے جدا سایے کے اس قامت سے پیدا ہے
قیامت ہوئے گا دلچسپ وہ محبوب سبحانی

جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے
بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسف ثانی

معاذ اللہ یہ کیا لفظ بے موقع ہوا سرزد
جو اس کو پھر کہوں تو ہوؤں مردود مسلمانی

کدھر اب فہم ناقص لے گیا مجھ کو نہ یہ سمجھا
کہ وہ مہر الوہیت ہے یہ ہے ماہ کنعانی

جو صورت اس کی ہے لاریب ہے وہ صورت ایزد
جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنی ربانی

حدیث من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر
کہ دیکھا جن نے اس کو ان نے دیکھی شکل یزدانی

غرض مشکل ہمیں ہوتی کہ پیدا کر کے ایسے کو
خدا گر یہ نہ فرماتا نہیں کوئی مرا ثانی

بس آگے مت چل اے سوداؔ میں دیکھا فہم کو تیرے
کر استغفار اب اس منہ سے ویسے کی ثنا خوانی

شیخ محمد ابراہیم ذوق

قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر

ساون میں دیا، پھر یہ شوال دکھائی — برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال، ابروے پرخم سے اشارہ — ساقی کو، کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی
ہے عکس فگن جامِ بلّوریں سے مے سرخ — کس رنگ سے ہوں ہاتھ، نہ مے کش کے حنائی
گوندے ہے جو بجلی، تو یہ سوجھے ہے نشہ میں — ساقی نے ہے، آتش سے مئے تیز، اُڑائی
یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے — ہووے نہ ممیّز، کُرّۂ ناری و مائی
پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے یہ زور — ہر نالے کی ہے، دشت میں دریا پہ چڑھائی
ہو قلزم عمّاں پہ لب جو متبسم — تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی
ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی — کافوار کی تاثیر گئی، جوز میں پائی
سردی حنا پہنچے ہے، عاشق کے جگر تک — معشوق کا، گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی
عالم یہ ہوا کا ہے، کہ تاثیر ہوا سے — گردوں پہ کِکے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی
کیا صرفِ ہوا ہے طرب و عیش کا عالم — ہے مدرسہ میں بھی، سبق صرف ہوائی
خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور — زاہد کا بھی، ہر دانہ، تسبیح ریائی
جو آئینۂ دل ہے، وہ عاشق کی بغل میں — گویا کہ ہے مینائے مے کاہ رُبائی
کرتی ہے صبا آئے، کبھی مشک فشانی — کرتی ہے نسیم آئے کبھی للخہ خائی
تھا سوزنئ خار کا، صحرا میں جہاں فرش — سبزہ نے وہاں مخملِ خوش رنگ بچھائی
آرائش گلشن کے لئے، جامۂ رنگیں — زیبائش غنچہ کے لیے تنگ قبائی
ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل — برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی
ابرو پہ کرے توس قُزح وسمہ، تو خورشید — سرخی شفق سے کرے ریش اپنی حنائی
رخسارۂ گل چیں کا ہے، سرخی سے یہ عالم — جوں وقتِ غضب، چہرۂ تُرکانِ خطائی
کیا ساغرِ رنگیں کو کیا یا جلد مہیا — نرگیس نے، تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
ہوتی متحمل نہیں، ایک ساغرِ گل کی — شاخِ گل احمر کی، نزاکت سے کلائی
اعجاز نواسنجی مُطر[illegible] ہے چمن میں — ہے شاخ گل [illegible] زبان شعر فوائی

حیرت کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر ہر طاہر تصویر کرے نغمہ سرائی

شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق عالم نے، تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

کہتے ہیں مہِ نو جسے، ابرو نے وہ تیری (۲۵) کی آئینہ چرخ میں ہے عکس نمائی

پرتو سے ترے، جامِ مے عیش، میر بزم لے ساغرِ جمشید کرے کار روائی

ٹپکے لبِ ساغر سے، وہ قطر کر دی شکل ہو مثل فلک، جس میں تماشائی خدائی

کیا علم سمائے ترا، سینہ میں فلک کے دریا کی کہاں ہو سکے، کاسہ میں سمائی

پڑھتا ہوں تیرے سامنے وہ مطلع موزوں احسنت، کہیں سن کے، بہائی و سنائی

(۳۰) یوں کرسی زر پر ہے، تیری جلوہ نمائی

جس طرح کہ مصحف ہو، سرِ رحل طلائی

رکھتا ہے تو، وہ دستِ سخا، سامنے جس کے ہے بحر بھی کشتی بہ کف از بہر گدائی

گمرہ کو ہدایت، جو تری راہ پہ لائے رہزن بھی اگر ہو، تو کرے راہ نمائی

تا ناخنِ شمشیر، نہ ہو ناخنِ تدبیر دشمن کی ترے ہو، نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو، نشاں سجدہ کا روشن گر چرخ کرے، در کی ترے ناصیہ سائی

عکسِ رخِ روشن سے ترے، جوں یدِ بیضا (۳۵) کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تری نذر، سدا نقدِ سعادت ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی

اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوڑے گر سر بہ ہوا، ہووے ترا تیر ہوائی

ہر کوہ، اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا ہو فیض رساں، جب تیرے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دلِ سنگ صنم میں ہر بت میں کرے، صورتِ حق جلوہ نمائی

ہر شعر غزل میں ترے، معنی شفا ہیں (۴۰) قربان، غزل کے تری، دیوان شفائی

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل پروانہ کو بھی، شمع نے اُنگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کے رہے، تیغ ہمیشہ خوں ریز کو ہو عہد میں تیرے، نہ رہائی

دیتا ہے دعا ذوقؔ کو مضمون ثنا میں ہے ذہن رسا کو، یہ کہاں اُس کے رسائی

ہر سال، شہا! ہووے مبارک یہ تجھے عید

تو، مسند شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

میر انیسؔ

مرثیہ

نمک خوان تکلم ہے، فصاحت میری　　ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری　　شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

ماجرا صبحِ شہادت کا بیان کرتا ہوں　　رنج واندوہ ومصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں　　جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں، ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے، نہ صاحب ایسا

آئے سجادۂ طاعت پہ امامِ دوجہاں　　اس طرف طبل بجایاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلی کہ زباں جن کی حدیث وقرآں　　وہ نمازی کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے، ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے، سبحان اللہ　　کیا رفیقانِ وفادار تھے، سبحان اللہ
صفدر وغازی وجرار تھے، سبحان اللہ　　زاہد وعابد وابرار تھے، سبحان اللہ
زن وفرزند سے فرقت ہوئی، مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

جب فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش کردار　　کس کے کمروں کو بصد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ، شہ عرش وقار　　علمِ فوج کو عباس نے کھولا اک بار
دشت میں نکہتِ فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

اک طرف اکبرِ مہ وسا جوانِ نایاب　　کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمدِ ایام شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب　　آنکھیں ایسی کہ رہا، نرگسِ شہلا کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا
شبِ معراج میں، محبوبِ خدا کو دیکھا

اللہ اللہ اسدِ حق کے نواسوں کا جلال　　چاند سے چہروں پہ بل کھائے ہوئے زلفوں کے بال
نیمچے کاندھوں پہ رکھے ہوئے، مانندِ ہلال　　گرچہ بچپن تھا، پہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال
صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
مورچے لشکرِ کفار کے ہٹ جاتے تھے

یک بیک طبل بجا فوج میں گرجے بادل　　کوہ تھرائے، زمیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے تلواروں کے پھل　　مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اجل
واں کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

شور میدانیوں میں تھا، کہ دلیر و نکلو!　　نیزہ بازی کرو، رہواروں کو پھیرو نکلو!
نہر قابو میں ہے، اب پیاسوں کو گھیرو نکلو!　　غازیو! صف سے بڑھو غول سے شیرو نکلو!
رستمو! دادِ وغا دو، کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدرِ کرار کی اولاد کا ہے

شور سادات میں تھا، یا شہِ مرداں مدد ے　　کعبہ دیں مدد ے، قبلۂ ایماں مدد ے
قوتِ بازوئے پیغمبرِ ذی شاں مدد ے　　دم تائید ہے، اے فخرِ سلیماں مدد ے
تیسرا فاقہ ہے، طاقت میں کمی ہے مولا!
طلب قوتِ ثابت قدمی ہے مولا!

شہ نے فرمایا، مجھے خود ہے شہادت منظور　　نہ لڑائی کی ہوس ہے، نہ شجاعت کا غرور
جنگ منظور نہ تھی ان سے پہ اب ہوں مجبور　　خیر، لڑ لو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور
ذبح کرنے کے لیے لشکرِ ناری آئے
کہیں جلدی مرے سر دینے کی باری آئے

حکم پانا تھا کہ شیروں نے اڑائے تازی　　مثلِ شہباز گیا ایک کے بعد اک غازی
واہ ری حرب، خوشا ضرب، زہے جانبازی　　اڑ گیا ہاتھ بڑھا جو پئے دست اندازی
لوٹتے رن میں سر و جسم نظر آتے تھے
ایک حملے میں قدم فوج کے جم جاتے تھے

یہی ہنگامہ رہا صبح سے، تا وقتِ زوال　　لاش پر لاش گری، بھر گیا میدانِ قتال
سرخرو خلق سے اٹھے، اسد اللہ کے لال　　مورچے سب تہ و بالا تھے، پرے سب پامال
کھیت ایسے بھی کسی جنگ میں کم پڑتے ہیں
جو لڑا سب یہی سمجھے کہ علی لڑتے ہیں

دوپہر میں وہ چمن بادِ خزاں نے لوٹا　　پتا پتا ہوا تاراج تو بوٹا بوٹا
باپ بیٹے سے چھٹا، بھائی سے بھائی چھوٹا　　ابنِ زہراؑ کی کمر جھک گئی بازو ٹوٹا
پھر سے نہ یاور، نہ وہ جاں باز نہ وہ شیدا تھے
ظہر کے وقت حسینؑ ابنِ علی تنہا تھے

تنِ تنہا شہ دیں لاکھ سواروں سے لڑے　　بے سپر برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے
صورتِ شیرِ خدا، ظلم شعاروں سے لڑے　　دو سے اک لڑ نہیں سکتا، یہ ہزاروں سے لڑے
گر ہو غالب، تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو
جو دل و جانِ علیؑ ابن ابی طالبؑ ہو

شیر سے تھے کبھی جنگل میں، ترائی میں کبھی　　ڈھال کو چہرے پہ روکا نہ لڑائی میں کبھی
تیغ حیدر نے کمی کی نہ صفائی میں کبھی　　فرق آیا نہ سر و تن کی جدائی میں کبھی
کبھی ابرو کا بھی ایسا نہ اشارا دیکھا
جس پہ اک وار کیا اس کو دوبارا دیکھا

اسد اللہ کے صدقے، شہ والا کے نثار　　وہی حملے تھے، وہی زور، وہی تھی تلوار
فتحِ حیدر نے کیا جنگ میں خیبر کا حصار　　مورچے فوج کے، حضرت نے بھی توڑے کئی بار
کیوں نہ ہو احمدِ مرسل کے نواسے تھے حسینؑ
فرق اتنا تھا کہ دو روز کے پیاسے تھے حسینؑ

پہلے تیروں سے کمانداروں نے چھاتی چھانی　　نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی
سر پہ تلواریں چلیں، زخمی ہوئی پیشانی　　خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخِ نورانی
جسم سب چور تھا، پرزے تھے زرہ جامے کے
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے

نہ رہا جب کہ ٹھہرنے کا فرس پر یارا　　گر پڑا خاک پہ، وہ عرش خدا کا تارا
غش سے کچھ دیر میں چونکا جو علی کا پیارا　　نیزہ سینے پہ، سناں ابنِ انس نے مارا
واں تو نیزے کی انی پشت سے باہر نکلی
یاں بہن خیمے کی ڈیوڑھی سے کھلے سر نکلی

کھینچ کر سینے سے نیزہ جو ہٹا دشمنِ دیں　　جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں جبیں
تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمر لعیں　　آسماں ہل گئے تھرا گئی مقتل کی زمیں
کیا کہوں تیغ کو کس طرح گلے پر رکھا
پاؤں قرآں پہ رکھا، حلق پہ خنجر رکھا

ڈھانپ کر ہاتھوں سے منہ بنتِ علی چلائی　　ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی
ضربِ اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی　　گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی
اٹھ کے دوڑی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا
منہ جو کھولا تو، سر شہ کو سناں پر دیکھا

مولوی عبدالحق

زمانہ

زمانے تین ہیں۔ گزشتہ، جسے ماضی کہتے ہیں۔ موجودہ، جو حال کہلاتا ہے۔ آئندہ، جس کا نام مستقبل ہے۔ ہر فعل کے لئے ضروری ہے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک زمانے میں واقع ہو، لیکن بلحاظِ معانی وتکوین فعل کی تین حالتیں ہوں گی۔

۱۔ کام جو ابھی شروع نہیں ہوا، یعنی مستقبل۔

۲۔ کام جو شروع تو ہوا لیکن ختم نہیں ہوا، یعنی افعال ناتمام۔

۳۔ کام جو ختم ہو چکا، یعنی افعال تمام۔

مستقبل

۱۔ مستقبل مطلق میں زمانۂ آئندہ کا علم تحقیقی ہوتا ہے، یا ایسا سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ مضارع میں احتمالی یا شرطی ہوتا ہے اور امر میں امکانی۔

۲۔ تمہیں پھر ایسا آدمی نہیں ملے گا، جہاں جاؤ گے میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ یہ مثالیں ایسی ہیں جن میں تحقیقی اور یقینی طور پر ایک امر کا بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض اوقات صرف ایسا سمجھ لیا جاتا ہے، گو حقیقت میں نہ ہو۔ مثلاً میں نے اگر وعدہ پورا نہ کیا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہ نہ آیا تو بڑی مشکل پڑے گی۔ تم امتحان میں کامیاب نہ ہوئے تو نوکری مشکل سے ملے گی۔

۳۔ بعض اوقات مصدر، ہونا، کا مستقبل مطلق، ہوگا، محاورے میں اس طرح مستعمل ہوتا ہے کہ وہ تمیز فعل کے معنی دیتا ہے مگر یہ ہمیشہ سوال کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے وہ مکان بہت قدیم معلوم ہوتا ہوگا؟ جس کے معنی 'شاید' یا 'غالباً' کے ہیں۔

فعل حال

(الف)۔ حال مطلق: اصل میں تو یہ فعل حالاتِ موجودہ کو ظاہر کرتا ہے یا کسی ایسے کام کو جو اس وقت ہو رہا ہے لیکن ضمناً زمانۂ حال کے متعلق دوسرے معنی پیدا ہوتے ہیں،

مثلاً:

۱۔ عادت یا تکرار فعل: جیسے، جب وہ آتا ہے یہی شکایت کرتا ہے۔ شام کے کھانے کے بعد وہ روزانہ باغ کی سیر کو جاتا ہے۔ یہ دونوں بھائی ہر جگہ ساتھ آتے اور جاتے ہیں

۲۔ عام امور صداقت جو کبھی باطل نہ ہوں گے یا جن کی نسبت ایسا خیال کیا جاتا ہے جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ جو خلق اللہ کی

۳۔ مستقبل قریب بلکہ قرب کے لئے۔ جیسے، میں ابھی جاتا ہوں۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ حال ناتمام بھی بعض اوقات ان معنوں میں ہوآتا ہے۔ جیسے، میں شہر جارہا ہوں۔

۴۔ زمانۂ گزشتہ کے لئے جیسے حال حکائی کہتے ہیں۔ جیسے، بابر ہندوستان پر حملہ کرتا اور افغانوں اور راجپوتوں کو شکست دیتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں، جو اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بے چاری معصوم لڑکی زمین پر پڑی تڑپ رہی ہے۔

۵۔ بعض اوقات ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو زمانہ گزشتہ میں شروع ہوا اور حال میں بھی جاری ہے۔ جیسے، میں چند روز سے دیکھتا ہوں (یا دیکھ رہا ہوں) کہ یہ لوگ اپنا فرض پورے طور پر ادا نہیں کرتے۔

(ب) حال تمام۔ جو اگرچہ بلحاظ زمانہ حال پورا ہو چکا ہے لیکن بعض اوقات سوائے اس کے اور معنی بھی دیتا ہے۔ مثلاً

ا۔ کبھی یہ ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں فعل تمام نہیں ہوا اور چاہئے تھا کہ حال مطلق استعمال ہوتا، لیکن محاورے میں حال تمام ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ جیسے: تم کیسے بے فکر بیٹھے ہو۔

۲۔ بعض اوقات ایسے موقع پر جہاں از روئے قیاس ماضی ناتمام ہونی چاہئے تھی۔ مثلاً: یہ لوگ کسی زمانے میں بڑے نامور گزرے ہیں۔ پچھلے زمانے میں یہ بھی اپنا نام کر گیا ہے۔

۳۔ بجائے ماضی مطلق۔ جیسے، مجھے کل ہی بادشاہ نے خلعت عطا فرمایا ہے۔

۴۔ بجائے حال حکائی یا ماضی مطلق۔ جیسے، حدیث میں آیا ہے۔ خدا نے فرمایا ہے۔ قرآن میں لکھا ہے۔

ماضی

(الف)۔ ماضی مطلق: ایسے فعل کو ظاہر کرتی ہے جو زمانہ گزشتہ میں بلاتعین وقت ہو، مگر علاوہ اس کے محاورے میں بعض دوسرے مقامات پر بھی استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً:

ا۔ بعض اوقات حال کے بجائے۔ جیسے، آپ یہاں بہت دنوں تک رہے (یعنی بہت دنوں سے ہیں)، یا حال تمام کے بجائے۔ جیسے، آپ بہت دنوں تک بچے رہے (یعنی بہت دنوں سے بچے ہوئے ہیں)۔ اب یہاں تنکا تک نہیں رہا۔ (نہیں رہا ہے)۔

۲۔ بجائے حال مطلق۔ جیسے، اس شہر میں جو آپ سے نہ ملا اس کا آنا یہاں بیکار رہا (یعنی جو آپ سے نہیں ملتا اس کا یہاں آنا بیکار ہوتا ہے)۔

۳۔ بجائے مستقبل۔ وہ آیا اور میں چلا (جس وقت وہ آئے گا میں چل دوں گا، یعنی اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا) یا بول چال میں نوکر کو آواز دیتے ہیں ''یہاں آؤ''۔ وہ جواب دیتا ہے ''آیا'' یا اس سے کہتے ہیں ''پانی لاؤ''، وہ کہتا ہے ''لایا''، ان میں مستقبل کے معنی ہیں۔

(ب) ماضی ناتمام جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی خاص زمانہ گزشتہ میں کام جاری تھا۔ اس کا اظہار مختلف صورتوں سے ہوتا ہے۔

(الف) وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ (ب) وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ (ج) وہ ایک مدت تک کالج میں پڑھتا رہا۔ (د) وہ مدت تک کالج میں پڑھا کیا۔

صورت اول: فعل جاریہ بلاتعین و بہ تعین وقت ہے۔

صورت دوم: اس وقت استعمال ہوتی ہے جب ہم کسی وقت خاص یا مدت کا ذکر تے ہیں۔ مثلا: جب میں وہاں گیا تو وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔

صورت سوم: ایسی حالت میں استعمال ہوتی ہے جب کہ زیادہ مدت کا اظہار کرنا مقصود ہو، یا جب اس کے ساتھ دوسرے فقرے میں اس سے کوئی نتیجہ نکالا جائے۔ مثلاً: وہ ایک مدت تک کالج میں پڑھتا رہا مگر کچھ حاصل نہ کیا۔

صورت چہارم: صورت سوم کے مثل ہے یا بعض اوقات ایسے موقع پر استعمال ہوتی ہے جب کہ دو ایسے فعل متواتر جاری ہوں جن کا باہم تعلق ہے۔ میں کہا کیا اور وہ سنا کیا۔

صورتِ سوم میں بھی اس طرح استعمال ہوتی ہے۔ ماضی نا تمام سے بعض اوقات خاص زمانے میں فعل کا بہ تکرار واقع ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً: جہاں کہیں وہ پہنچے تھے لوگ ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے تھے۔

بعض اوقات فعل امدادی حذف بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے جہاں کہیں وہ جاتے لوگ ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے۔

(ج) ماضی تمام: جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کام کو ختم ہوئے ایک مدت گزر چکی ہے۔ جیسے، میں اس سے ملنے گیا تھا۔ کبھی ماضی تمام ایک فعل گزشتہ کے فعل ماقبل کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے جیسے، وہ اس وقت آیا جب کہ میں کھانا کھا چکا تھا۔

مولوی عبدالحق

حروف جار

حروف جار کو حروف ربط بھی کہتے ہیں۔ حرف ربط وہ ہیں جو ایک لفظ کا علاقہ کسی دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔

۱۔ کا، کے، کی۔

۲۔ نے۔

۳۔ کو، تئیں، سے، میں، تک، پر۔

یہ حرف ربط سادہ قسم کے ہیں جو عموماً اسم یا ضمیر یا تمیز کے ساتھ آتے ہیں اور ان کی حالت کا پتہ دیتے ہیں، مثلاً نمبر (۱) حالت اضافی کے لئے (۲) حالت فاعلی کے لئے (۳) حالت مفعولی ظرفی یا طوری کے لئے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے الفاظ ہیں جو حروف ربط کا کام دیتے ہیں مثلاً پاس، تلے، پیچھے، آگے، بیچ، سمیت، اوپر، نیچے، باہر، لئے، ساتھ، سنگ، سامنے، مارے۔ مگر یہ تمام الفاظ بجز ''سمیت'' کے اضافی حالت کے ساتھ آتے ہیں، جیسے اس کے پاس، صندوق کے نیچے، دھوپ کے مارے۔ ان میں سے بعض کی اصل سنسکرت ہے۔

اسی طرح بہت سے فارسی و عربی کے الفاظ بھی حروف کا کام دیتے ہیں جیسے بغیر، اندر، نزدیک، باعث، واسطے، سبب، سوا، طرح نسبت، بجا، بجز موجب، پیش پیش، قبل، گرد، درمیان، یہ الفاظ بھی اضافی حالت کے ساتھ آتے ہیں۔

ہندی کے بعض حروف ربط دو دو مل کر آتے ہیں اور ایک حرف کا کام دیتے ہیں۔ جیسے وہ چھت پر سے گر پڑا، نالی میں سے نکل گیا، یہ تو اس میں کا ہے، دیوار پر سے گر گیا۔

حروف ربط (جار) مفصلۂ ذیل اسما کے بعد آتے ہیں۔

سے:

(۱) اسم کے بعد۔ جیسے: احمد سے کہو۔ (۲) صفت کے بعد (جب بطور اسم مستعمل ہو)۔ جیسے: بد سے بچو، نیک سے ملو۔ (۳) ضمیر کے بعد: اس سے کہو۔ (۴) فعل کے بعد: اس کے سننے میں فرق ہے۔ (۵) تمیز کے بعد: آہستہ سے کہو۔

میں:

ظرف مکان کے ساتھ۔ جیسے،

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

وہ مجھے گلی میں ملا۔

جو دل میں ہے وہ زبان پر نہیں

'ح' خالی جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ۔ منہ میں دانت پیٹ میں آنت۔ مرد ہو تو میدان میں آؤ۔ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا۔ شیشے میں اتر آئی۔

ظروف زمان کے ساتھ : جیسے، آٹھ میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ دیر میں آنے سے نہ آنا اچھا۔ سیر کا مزا چاندنی رات میں۔ سال میں ایک بار ہفتے میں چار بار۔ آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ۔ گھڑی میں تولا گھڑی میں ماشہ۔

حالت یا کیفیت، طور یا طریقے کے لئے۔ جیسے، وہ غصے میں ہے۔ رنج میں یا خوشی میں ہے۔ وہ مارے خوشی کے آپ میں نہیں سماتا۔ ہوش میں آؤ۔ اللہ کے نام میں برکت ہے۔ حرکت میں برکت۔ بتیس دانتوں میں ایک زبان۔ نام میں کیا دھرا ہے۔ بات میں بات پیدا کرتا ہے۔ دم آ گیا۔ اس کی زبان میں اثر ہے۔ ہاتھ میں شفا ہے۔ دل میں کھوٹ ہے۔

اظہارِ نسبت کے لئے۔ جیسے عمر میں بڑا۔ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہے۔

مقابلے کے لئے۔ جیسے، مجھ میں اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لاکھ میں ایک ہے، آدمی آدمی میں کیا فرق ہے۔

وزن کے لئے۔ جیسے، تول میں کم ہے، سیر میں چار چڑھتے ہیں۔

تعداد کے ساتھ۔ جیسے، دس آدمیوں میں تقسیم کرو۔ سو میں کہہ دوں، لاکھ میں کہہ دوں، بیس میں کیسے گزر ہوگا۔ تین میں نہ تیرہ میں۔ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔

تمیز کے لئے۔ (کسی دوسرے اسم سے مل کر) جیسے، حقیقت میں، آخر میں، باتوں باتوں میں، ہنسی میں، خوشی میں وغیرہ۔

سے

کسی شئے کی ابتدا یا ماخذ کو ظاہر کرتا ہے۔ کبھی ابتداء بہ لحاظ مکان۔ جیسے سر سے پاؤں تک۔ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ۔ اس سرے سے اس سرے تک۔ زمین سے آسمان تک۔ کہاں سے کہاں تک۔

بہ لحاظ زماں۔ جیسے، چھے بجے سے بیٹھا ہوں۔ صبح سے انتظار کر رہا ہوں۔ کل سے یہی عالم ہے۔ برسوں سے اس مخمصے میں گرفتار ہوں۔ مدت سے، قدیم سے وغیرہ۔

بہ لحاظ تعداد کے۔ چھے سے سات تک۔

ماخذ یا اصل۔ جیسے، وہ عالی خاندان سے ہے۔ یہ کہاں سے آیا ہے۔ زمین سے نکلا ہے۔ عین کی آواز حلق سے نکلتی ہے۔

نسبت یا علاقہ۔ جیسے، مجھے کام سے کام ہے اس سے مجھے کیا تعلق۔ اسے پڑھنے سے نفرت ہے۔ آنکھوں سے اندھا، کانوں سے بہرا، دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔

مقابلہ۔جیسے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔سختی سے شوم بھلا۔

استعانت۔جیسے تلوار سے فتح کیا۔قلم سے لکھا۔ڈنڈے سے خبر لی۔شاہ صاحب کی دعا سے اچھا ہو گیا۔

انحراف۔جیسے قول سے، بات سے، وعدے سے پھر گیا۔راستے سے لوٹ گیا۔

علاحدگی یا جدائی۔جیسے، وہ نوکری سے الگ ہو گیا۔کام سے گھبراتا ہے۔شہر سے نکل گیا۔کام سے جی چراتا ہے۔دل سے اتر گیا۔

تمیز (کسی دوسرے اسم سے مل کر) جیسے خیر سے شوق سے، دل سے وغیرہ۔

(ف) بعض جملوں میں 'سے' اور 'کے' کے استعمال سے بین فرق پیدا ہو جاتا ہے۔لہٰذا اس موقع پر اس کا فرق بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔مثلاً 'کمرے کے باہر اور کمرے سے باہر' میں فرق ہے۔کمرے کے باہر کے معنی ہیں کمرے کے باہر کی طرف اور کمرے سے باہر یعنی کمرے کے اندر نہ ہونا۔جیسے، کمرے کے باہر بیٹھو، کمرے سے باہر جاؤ۔

اسی طرح کس لئے اور کس کے لئے، میں فرق ہے۔کس لئے کے معنی ہیں کیوں یا کس غرض سے اور کس کے لئے، یعنی کسی شخص وغیرہ کے واسطے۔

تک

انتہا کے لئے، بہ لحاظ مکان۔جیسے، شہر تک سر سے پاؤں تک۔

بہ لحاظ زماں۔جیسے، شام تک، مہینہ بھر یا سال بھر تک۔چھ بجے تک۔

عام اشیاء اور خیالات کے لحاظ سے۔جیسے، مجھ تک، اس کا نام تک نہ لیا خبر تک نہ ہوئی۔سلام تک نہ لیا۔اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔خیال تک نہ آیا۔گمان تک نہ تھا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (غالب)

اصل میں 'اوپر' سے ہے 'پر' کا مخفف 'پہ' بھی (اہل لکھنؤ زبر سے اور اہل دہلی زیر سے بولتے ہیں) انہیں معنوں میں آتا ہے۔

'پر' کسی شئے کی اوپر کی سطح سے تعلق ظاہر کرتا ہے، خواہ متصل ہو یا منفصل۔اس کے بعد قربت اور درمیان کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

بہ لحاظ مکان۔جیسے، خدا کا دیا سر پر، چھت پر، بنارس گنگا پر واقع ہے۔دروازے پر کھڑا ہے۔

بہ لحاظ زماں۔جیسے، وقت پر کام آیا۔

انحصار جیسے میری زندگی اسی پر ہے۔ایک مجھی پر کیا ہے۔سب کا یہی حال ہے۔

خاطر کے معنوں میں۔جیسے، وہ نام پر مرتا ہے۔روپئے پر جان دیتا ہے۔

واسطے کے معنوں میں آتا ہے۔جیسے، کام پر گیا ہے، مہم پر گیا ہے۔

طرف کے لئے۔جیسے، اس کی باتوں پر نہ جانا۔اس پر کسی کا خیال نہ گیا۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

آگے

مکان کے لئے آتا ہے۔جیسے،

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے (غالبؔ)

مقابلے کے لئے۔جیسے میرے آگے اس کی کیا حقیقت ہے، یعنی میرے سامنے۔

زماں کے لئے جیسے

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی

اب کسی بات پر نہیں آتی (غالبؔ)

ساتھ

ایک تو معیت کے عام معنوں میں ہے۔دوسرے جب ضمیر کے ساتھ آتا ہے تو 'باوجود' اور باوصف کے معنی دیتا ہے۔جیسے، اگرچہ اس وقت اس نے صاف جواب دے دیا لیکن اسی کے ساتھ آئندہ کا وعدہ بھی کیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

از: مناظر عاشق ہرگانوی

شمس الرحمٰن فاروقی ایک ایسے قلم کار ہیں جن پر ذہن کا غلبہ ہے۔ یہ ان کی کوئی کمزوری نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیت اور وجود کی نوعیت ہے۔ وہ بہت بڑے ادیب، عظیم نقاد اور ایک اچھے انسان ہیں۔ ایسے آدمی کم ہوتے ہیں جنہیں انسان ہونا میسر ہو) انہوں نے تنقید لکھی تو دھوم مچادی۔ تبصرہ پر آئے تو نئی راہیں نکالیں اور اس فن کو خوب برتا۔ ترجمے کیے تو ان پر تخلیق کا دھوکہ ہوا اور شاعری کی طرف متوجہ ہوئے تو جدید احساس کی تین واضح صورتوں کو پیش کیا۔ یہ تینوں صورتیں تجرباتی اور تجزیاتی بنیاد ہیں۔ انسان اور کائنات، انسان اور معاشرہ اور ذات اور حقیقت زماں کے تعلق سے وہ ایک اکائی تک پہنچتے ہیں اور ان کی نظر جدید سے جدید تر کی طرف سفر کرتی ہے۔ غضب کے صحافی ہیں۔ ایڈمنسٹریٹ سروس کے اونچے عہدے پر فائز ہیں اور بے حد مصروف انسان ہیں۔ لیکن میرے کرم فرما ہیں۔ مجھ سے خاص انسیت اور اپنائیت رکھتے ہیں۔ میں نے انٹرویو کی پیش کش رکھی تو فوراً راضی ہو گئے۔ مگر اس شرط پر کہ باتیں جم کر ہوں اور سامنے ٹیپ ریکارڈ رکھ کر ہوں۔ چونکہ میرے پاس ٹیپ ریکارڈ نہیں ہے۔ اس لیے کئی مہینے تک انٹرویو کے سلسلے میں باتیں نہ ہوسکیں۔ وہ بضد میں احساس کمتری میں مبتلا۔ آخر جم کر باتیں کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ جواب دینے کے لئے بیٹھ گئے۔ میں نے پہلا سوال کیا۔

ہرگانوی: آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

فاروقی: ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء پرتاپ گڑھ اودھ (یو۔پی) اصل وطن اعظم گڑھ ہے۔

ہرگانوی: آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟

فاروقی: اردو فارسی ہائی اسکول تک پڑھی ہے۔

ہرگانوی: لیکن جہاں تک مجھے یاد آتا ہے۔ ''غبار کارواں'' میں آپ نے بی۔اے تک کا ذکر کیا ہے؟

فاروقی: میں نے ''غبار کارواں'' میں کہیں نہیں لکھا کہ میں نے بی۔اے تک اردو پڑھی ہے جہاں تک مجھے یاد آتا ہے۔ میں نے یہ لکھا ہے کہ میں بی۔اے کرنے کے بعد یا اس زمانے میں غالبؔ اور شیکسپیئر کو پڑھا۔

ہرگانوی: آپ کے ادبی سفر کا آغاز کب ہوا؟

فاروقی: بہت دن ہو گئے۔ اب تاریخ بھی یاد نہیں۔ بچپن میں ایک فلمی رسالہ ''گلستان'' نامی نکلتا تھا۔ یہ بات شاید ۱۹۴۴ء کی ہے۔ رسالہ ۱۹۴۴ء یا شاید ۱۹۵۰ء تک نکالتا رہا۔

ہرگانوی: ادب کے ساتھ تنقید کا کیا تعلق ہے؟

فاروقی: سوال سمجھ میں نہیں آیا، تنقید بھی ادب ہی ہے۔

ہرگانوی: اچھا، یہ بتائے تنقید کے بنیادی مقتضیات کیا ہیں۔

فاروقی: فن پارے کی پہچان متعین کرنا، اس کی تعین قدر کرنا، نئے فن پاروں کی خوبیاں اور خرابیاں، پرانے فن پاروں کی روشنی میں اور خود ان کے اپنے سیاق وسباق میں بیان کرنا، پرانے فن پاروں میں نئی خوبیاں اور معنویتیں تلاش کرنا۔

ہرگانوی: ملکی اور غیر ملکی تنقید نگاروں میں آپ کن کن سے متاثر ہیں۔

فاروقی: حالی، محمد حسن عسکری، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، ارسطو، کولرج، آئی۔اے رچرڈسن ولیم ایمپسن کے علاوہ لسانیاتی اور متنی تنقید کے علمبردار مختلف نقادوں سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔

ہرگانوی: ہر نئے دور میں کسی نئے لکھنے والے کو اپنے لیے کوئی نیا اسلوب درکار ہوتا ہے، آخر کیوں؟

فاروقی: آپ نے اس سوال میں ''نئے'' کی بھرمار کردی۔ بنیادی بات صرف اتنی ہے کہ وہ فن کار کا اپنا اسلوب نہیں ہوتا۔ فن کی دنیا میں زیادہ در نہیں ٹھہر پاتے۔ اس میں نئے دور، نئے فن کار، نئے اسلوب کی شرط نہیں ہوتی ہے۔ ہر فنکار کو اپنا اسلوب درکار ہوتا ہے۔ کوئی اسلوب قطعی نیا نہیں ہوتا، ہاں اس میں انفرادیت ضرور ہوسکتی ہے۔

ہرگانوی: کیا تنہا نے مسائل کی جستجو ہی ادب کی تخلیق کے لئے کافی ہے؟

فاروقی: جستجو سے ادب نہیں بنتا، ادب اظہار سے بنتا ہے۔ مسائل نئے ہوں یا پرانے اگر اظہار نہیں ہے تو ہزار جستجو کرتے رہیے۔ بال عنقا ہی ہاتھ لگے گا۔

ہرگانوی: ملکی اور غیر ملکی شاعروں میں آپ کن کن کو پسند کرتے ہیں؟

فاروقی: یہ فہرست مشکل ہے۔ بہر حال دو چار نام ذہن میں آئے ہیں۔ غالبؔ، بیدل، شکسپیئر، بودلیئر، سافیکلیز، ٹی۔ ایس ایلیٹ، یوری پڈیز، قدیم چینی اور جاپانی شاعری، فیضی، میر، جان ڈن وغیرہ وغیرہ

ہرگانوی: نثری نظم اور آزاد غزل کے تجربے سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

فاروقی: نثری نظم اردو میں بہت دنوں سے لکھی جارہی ہے۔ لیکن اب تک اسے تجربہ ہی کہا جارہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سرسبز ہونے کے امکانات کم ہیں۔ آزاد غزل کو تو بہت ہی کم دن ہوئے ہیں اس کے بارے میں کوئی امید افزا بات نہیں کہہ سکتا۔

ہرگانوی: اردو میں اچھے ناول نہیں لکھے جارہے ہیں۔ وجوہات کیا ہیں؟

فاروقی: ناول نگار ہی نہیں ہیں۔

ہرگانوی: آج کے اردو افسانہ سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

فاروقی: نیا افسانہ عبوری دور سے باہر نکل رہا ہے۔ لیکن ابھی اس کو پوری طرح قائم ہونے میں وقت لگے گا۔ میں بہر حال مطمئن

ہوں کہ ترقی پسند افسانہ کی جگہ لینے والا افسانہ وجود میں آ رہا ہے۔

ہرگانوی: کیا جدیدیت کا زور کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور لوگ (قلم کار) ترقی پسندی کی طرف لوٹ رہے ہیں؟

فاروقی: جدیدیت کی شدت کم ہو رہی ہے یعنی انتہا پسندی کم ہو رہی ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک جوں جوں پرانی ہوتی گئی۔ اس میں شدت بڑھتی گئی۔ ادّعائیت بڑھتی گئی۔ آخر کار اسے میدان خالی کرنا پڑا۔ جدیدیت اب ایک بالغ اور باشعور نوجوان کی طرح ہے۔ ترقی پسندی کی طرف لوٹنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ مراجعت اس چیز کی طرف ہوتی ہے جس کا وجود ہو۔ ترقی پسندی کا وجود اب کہاں؟

ہرگانوی: ادب میں جنس کس حد تک جائز ہے؟

فاروقی: ادب اگر ادب ہے تو سب کچھ جائز ہے۔ اگر ادب نہیں ہے تو خدا بھی جائز نہیں۔

ہرگانوی: کیا اردو شاعری اور اردو افسانے میں جنس کی نشاندہی کر سکیں گے؟

فاروقی: یہ کام میرے بس کا نہیں۔ اس میں کچھ دخل نقطہ نظر کا بھی ہے۔ مجھے ''ٹھنڈا گوشت'' میں جنس نہیں خوف نظر آتا ہے۔ ''لحاف'' میں جنس ہے۔ لیکن ادبی ضروریات کے طور پر ہے۔ ''سونفیا'' میں جنس ہے اور غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو ہر دائرہ تنگی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو ننگی تصویر نہیں بلکہ اس کی اصل درکار ہوتی ہے۔ یہ سب مباحث بالکل فضول ہیں کہ جنس کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے۔ بس صرف ایک ہے۔ ادب کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے؟

ہرگانوی: آج کے اردو رسائل میں کتابوں پر جو تبصرے شائع ہو رہے ہیں کیا وہ تبصرہ نگاری کے فن پر پورے اترتے ہیں۔

فاروقی: جی نہیں۔

ہرگانوی: آج کی اردو صحافت؟

فاروقی: بہت کمزور اور بڑی حد تک بے اثر ہے۔

ہرگانوی: ترجمے کی افادیت کیا ہے؟

فاروقی: اصل زبان میں فن پارہ ہاتھی ہے اور ترجمہ شدہ زبان میں اس کا قاری ان چاروں اندھوں کی طرح جو اسے ٹٹول کر سمجھتا چاہتے ہیں کہ یہ ہے کیا بلا۔ چونکہ زبانیں بہت سی ہیں اور ادب بہت سا اور زبانوں کو جانے والے کم، اس لیے ترجمہ بہت ضروری ہے۔ اندھوں کے پاس آنکھیں نہیں۔ لیکن ہاتھ تو تھے۔ ترجمہ نہ ہو تو آنکھوں کے ساتھ ہاتھ سے بھی گئے۔

ہرگانوی: فن کے لحاظ سے آپ کی سب سے بڑی آرزو کیا ہے۔

فاروقی: سوال واضح نہیں ہے۔ لیکن میری آرزو یہ ہے کہ نقد و شعر میں میرا وہی مقام ہو جو کولرج اور ایلیٹ کا ہے۔ یعنی تنقید اور

شاعری دونوں میں میرا کارنامہ بڑا درجہ رکھتا ہو۔

ہرگانوی: آپ کی دانست میں آج کے انسان کے کرب کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

فاروقی: یقین اور سہارے کا فقدان، موجودہ زمانے نے ہم لوگوں سے تمام ایقان اور اعتماد چھین لیے ہیں۔

ہرگانوی: ادبی سطح پر آپ آج کے اور پہلے ادیبوں کے روابط کے بارے میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔

فاروقی: پہلے زمانے کے ادیبوں میں آپس کے اختلافات آپس ہی میں رہتے تھے۔ دنیا کے سامنے بہت کم آتے تھے۔ آج کل ہم سب ایک دوسرے سے برسرعام ہاتھا پائی کر رہے ہیں۔

ہرگانوی: حسن و عشق کے متعلق آپ کا نظریہ؟

فاروقی: کسے کہ درد پنہائے نہ دارد

تنے دارد و لے جانے نہ دارد

اگر جانے ہوسداری طلب کن

تب وتا ہے کہ پایانے نہ دارد (اقبال)

ہرگانوی: کیا زندگی نے آپ کو دھوکہ بھی دیا ہے؟

فاروقی: بہ کویش رہ سپاری اے دل اے دل

مرا تنہا گزاری اے دل اے دل

دمادم آرزوہا آفرینی

مگر کارے نہ داری اے دل اے دل

ہرگانوی: کیا آپ اردو کے مستقبل سے مطمئن ہیں؟

فاروقی: جی نہیں لیکن مایوس بھی نہیں ہوں۔

ہرگانوی: آپ کی کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

فاروقی: یار فہرست زبانی یاد نہیں۔ کچھ تنقیدی مجموعے ہیں، کچھ اشعار کی کتابیں، ایک ارسطو کا ترجمہ، ایک مجموعہ مضامین کا زیر ترتیب ہے۔ انگریزی میں، ایک اردو میں بھی بن جائے گا۔

ہرگانوی: شکریہ۔

فاروقی: شکریہ۔

کنڑ ادیبوں سے ملاقات

10 جولائی کی دوپہر کو سلام بن رزاق کے ساتھ تبادلۂ خیال کے لئے کنڑ ادیبوں کی ایک خصوصی نشست بلائی گئی تھی۔ اس نشست میں مرکزی ساہتیہ اکادمی بنگلور ریجنل سنٹر کے سربراہ اگراہارا کرشنا مورتی نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ کنڑ اور اردو ادیبوں کے تبادلۂ خیال کی یہ محفل میرے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہے اردو اکاڈمی کے صدر نے یہ پیش قدمی کی ہے جس کی ستائش کی جانی چاہیے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ایسی کوششیں جاری رہیں گی۔

انہوں نے کہا کہ اردو مذہب سے غلط طور پر منسوب ہوگئی ہے۔ ہمیں کشادہ دلی کے ساتھ ایسی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ سلام بن رزاق مرہٹی اور ہندی زبانوں سے کافی تراجم اردو میں کر رہے ہیں۔ ان کی کہانیاں یک لو یہ، کام دھینو اور شرون کمار وغیرہ ہندو دیومالائی کردار ہیں اور انہوں نے مجھے انتظار حسین کی یاد دلا دی، جن کے افسانوں میں ہندو اور بدھ تہذیب کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ میرا پہلا تاثر تھا۔ پھر میں نے غور کیا کہ سلام ان کو کس طرح برت رہے ہیں۔ ایک تاریخی تناظر سے انہوں نے ان کرداروں کو عہد حاضر میں پہنچا کر انہیں نئی معنویت دی ہے۔ ندی تمام تر تمثیلی کہانی ہے۔ کنویں کے مینڈک کا تصور کنڑ میں بھی ہے۔ لیکن میں دعوت دیتا ہوں کہ آپ تبادلۂ خیال کو آگے بڑھائیں۔

جناب ماہر منصور نے کہا کہ سلام صاحب پہلے اپنا ایک افسانہ پڑھ کر سنائیں گے۔ لیکن چوں کہ شریک ادیبوں کو اکاڈمی کی طرف سے افسانے پہلے سے فراہم کر دئے گئے تھے، اس لئے سب نے بیک زبان ہو کر کہا کہ سلام کے افسانے پڑھنے کے مواقع ہمیں آئندہ بھی ملتے رہیں گے، اس وقت ہم اُن سے تبادلۂ خیال کرنا زیادہ پسند کریں گے۔

شری اگراہارا کی دعوت پر پہلے کنڑ کے مشہور ادیب شودرا شری نواس نے 1993 کے بمبئی کے فسادات کی جانچ ٹیم میں شامل تھے اور جنہوں نے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا تھا اور جو کنڑ میں اقبالیات کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، تبادلۂ خیال کا آغاز کیا۔

شودر شری نواس: سلام بن رزاق کی کہانیوں کے ذریعے ہندو دیومالائی کرداروں جیسے ایکلو ئیا اور شرون کمار کو جس طرح اردو میں قبول کیا جا رہا ہے، وہ ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ یہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کا باعث ہے کہ اردو صرف مسلم تہذیب کی ترجمان ہے۔ سلام کی کہانیوں سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ اردو پوری ہندوستانی روایات کو ساتھ لئے چل رہی ہے۔ کیا سلام کی یہ کوشش شعوری ہے؟

سلام بن رزاق: آپ نے متھ کے بارے میں پوچھا ہے جیسے شرون کمار، کام دھنیو، ایکلو ئیا وغیرہ۔ عام تاثر یہ ہے کہ مسلمان صرف مذہبی ہوتا ہے۔ اسے دوسروں کی تہذیب و تمدن سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ میری کہانیاں میری زمین، میرے کلچر کی ترجمان ہیں۔ ویسے بھی ساہتیہ کا کوئی دھرم نہیں ہوتا اور سارے دھرم ساہتیہ میں آکر ضم ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات fundamentalists ہر مذہب میں ہیں۔ ہمارا خطاب ان کشادہ ذہنوں سے ہے جو ہماری بات

سمجھتے ہیں۔میری کہانیاں اردو، ہندی، مرہٹی بھی میں چھپی ہیں اور ہر ایک میں پسند کی گئی ہیں۔

بچنہلی ناگراج: میں کرناٹک کی واحد یک لسانی یونیورسٹی ہمپی یونیورسٹی کا رجسٹرار اور ادیب ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ سلام کی کہانیاں صرف کسی اردو رائٹر کی کہانیاں نہیں بلکہ یہ کہانیاں ایک ہندوستانی رائٹر کی کہانیاں ہیں۔سلام اپنی باتوں کو پیش کرنے کے لئے اسلامی اساطیر سے بھی کام لے سکتے تھے،لیکن انہوں نے سرزمین سے جڑی ہوئی روایات کی مدد سے اپنی باتیں کہی ہیں،جس سے خود اردو زبان کے سیکولر ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے۔

ہری ہر پریا: میرا نام ہری ہر پریا ہے۔میرے تین سوال ہیں۔ پہلا سوال کتاب ''اردو ساہتیہ'' میں بی آر ناگراج نے کہا ہے کہ گذشتہ دوسو سال کے دوران ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ ذخیرہ اردو زبان میں ہے۔ ہمارے اپنے کلچر کے بارے میں جس قدر مواد اردو میں ہے اور کسی زبان میں نہیں۔اسی پس منظر میں میں یہ جاننا چاہوں گا سلام صاحب سے کہ کیا اسی کلچر کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں اپنی تخلیقات میں۔اور دوسرا یہ کہ کیا اقلیتیں اپنے آپ کو یہاں کی اکثریت میں خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہیں۔تیسرا یہ کہ کنڑ کے مشہور گیان پیٹھ اعزاز یافتہ عظیم ادیب کوئمپو کا عالمی انسان کا تصور ہے کیا آپ کی تخلیقات اس تصور سے ہم آہنگ ہیں۔ایکلو یا اور شراون کمار میں مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔البتہ ندی کے متعلق میرا یہ تاثر ہے کہ آپ اپنے کرداروں کو مین اسٹریم میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔کیا یہ صرف مسلمانوں کی حد تک ہے یا آپ دوسروں کو بھی اس میں شامل کرنا چاہتے ہیں؟

سلام بن رزاق: میں اس سے پہلے جو بات کلچر اور متھ کے بارے میں کہہ چکا تھا اس میں ذرا سا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ایران میں مذہب، اسلام ہے۔اس کے باوجود وہاں کا جو کلچر ہے، یعنی ایرانی کلچر، اس میں آج بھی جوان کے ہیرو ہیں رستم، سہراب، افراسیاب ہیں۔ مذہب اپنی جگہ لیکن اپنے کلچر سے وہ لوگ اسی طرح سے جڑے ہوئے ہیں۔ میرا جو منشاء ہے ان کہانیوں میں اپنے کلچر کو شامل کرنے کا کہ ہم ہندوستانی مسلمان اور اردو پڑھنے والے ہمارے اس کلچر سے اچھی طرح سے واقف ہو جائیں۔ بہت سی غلط فہمیاں یہ ہوتی ہیں جیسے مثال کے طور پر ارجن یا مہا بھارت کے بہت سارے کیرکٹر، پرانوں کے بہت سارے کیرکٹرز، یہ ممکن ہے کہ ہندو مذہب میں پوجیہ ہوں، ان کو دیوتا مانا جاتا ہو، لیکن وہ ہمارے کلچر کے ہیرو ہیں۔ہم انہیں ہیرو مانتے ہیں۔اور اسی لئے ان افسانوں میں جو متھ کو استعمال کیا ہے تو ان کو دیوتا بنا کر لیا نہیں ہے۔ میں نے ایک انسان کی حیثیت سے ان کو دیکھا ہے۔کرشن ہمارا ہیرو ہے۔رام ہمارا ہیرو ہے، علامہ اقبال نے تو رام کو امام ہند کہا ہے۔کرشن کے بارے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ جائسی کی شاعری میں کرشن کے بارے میں دوہے ہیں۔اور نظیر اکبر آبادی، اس نے ہمارے پورے ہندوستان کو اپنی شاعری میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔فکشن تو خیر ہے ہی۔قرۃ العین حیدر کا جو ناول ہے '' آگ کا دریا'' وہ کیا ہے۔اس نے صاف کہا ہے کہ ہندوستان کی تین ہزار برس کی جو تہذیب ہے اس کو ایک کردار بنا کر میں نے اس ناول کے اندر پیش کیا ہے۔اب اس

سے زیادہ ہم اس کلچر سے اور کتنا جڑیں گے۔ اور میں نے جان بوجھ کر یہ سب نہیں کیا ہے۔ یہ سب میرے لاشعور کے اندر ہے۔ چونکہ میں اس سے قریب ہوں، ان سے واقف ہوں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اس طریقے سے یہ ساری باتیں لوگوں تک پہنچیں۔ دوسری بات یہ کہ کیا ان کہانیوں کے اندر کیا ہم اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں؟ دیکھئے یہ سوال جو ہے یہ اس موقع کے لئے مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ ہم تو اسی خاک سے اٹھے ہیں، یہیں جیتے ہیں یہیں مریں گے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا وقت آتا ہے کہ ہم خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن وہ لمحاتی کیفیت ہوتی ہے اور لمحاتی کیفیت تو ہر انسان پر گزر سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ کو یہ لگے کہ آپ کے گھر میں چور گھس آیا ہے تو کیا آپ اپنے کو غیر محفوظ نہیں محسوس کریں گے؟ تو یہ غیر محفوظ ہونے کا عمل یا اس کا ردعمل یا reaction جو ہے وہ واقعات پر اور حالات پر ہے۔ ویسے یہاں ہمیں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہم اس کو اپنا گھر مانتے ہیں اور اسی گھر میں رہیں گے ہم اور اسی گھر میں مریں گے۔ حالات کے تحت feelings بدلتی رہتی ہیں اور حالات کے تحت یہ جو feelings بدلتی ہیں انہیں ختم کرنا یا انہیں دور کرنے کا کام جو ہے وہ آپ کا اور ہمارا ہے چاہے وہ کنٹر کا ادیب ہو چاہے اردو کا ادیب ہو یا مراٹھی کا ادیب ہو یا ہندوستانی کسی بھی بھاشا کا ادیب ہو۔ وہ ادیب اس سمسیا کو، اس خوف کو اور اس گتھی کو وہ سمجھ سکتا ہے اور سلجھا سکتا ہے۔ یہی میرا موقف رہا ہے اور میری چھوٹی موٹی جو بھی کہانیاں ہیں ان میں میں نے اسی کو اساس بنا کر لکھا اور لکھتا رہوں گا۔

دوسری بات تھی کہ عالمی انسان کی بات یعنی وشو مانو۔ اس کا اشارہ افسانہ ندی میں آخر میں جو مگر مچھ دعا کرتا ہے، یہ ندی جو چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں میں بٹ گئی ہے۔ ایک ٹاپو کا راجا، ٹاپو کا بادشاہ، وہ ٹاپو کا سردار، یہ جو ٹاپوؤں میں بٹ گئے ہیں اب وہ ٹاپو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ٹاپو ہمارے فرقے ہو سکتے ہیں۔ وہ ٹاپو ہمارے ملک کے ہو سکتے ہیں۔ وہ ٹاپو ہماری ذاتیں ہو سکتی ہیں، وہ ٹاپو ہمارے نظریے ہو سکتے ہیں، کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے سارے جھگڑے انہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ ہمارے سارے آپسی اختلافات جو ہیں انہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ تو وہ جو مگر مچھ ہے، اس کا جو نظریہ ہے وہ یہی ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ یہ جو چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں کی یہ جو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، یہ جو نا اتفاقیاں ہیں، یہ جو فاصلے ہیں ایک دوسرے کے درمیان جو فرق ہے، اس فرق کو مٹانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ سیلاب، باڑھ آجائے ندی میں اور یہ ساری چیزیں مٹ جائیں۔ اب مٹ کر نئے سرے سے ایک نیا کلچر ایک نئی دنیا اور ایک نئی سوچ اور ایک نئی فکر جو ہے، وہ دوبارہ ڈیولپ ہو اور ہم انسان جو ہیں وہ بحیثیت ایک انسان رہیں۔ بحیثیت جانور، مینڈک، کیڑے مکوڑوں کی طرح نہ رہیں۔ میں پتہ نہیں کہاں تک اپنی بات کو کہہ سکا ہوں، تھوڑا جذباتی بھی ہو گیا تھا، سوری میں کوئی صحافی نہیں، افسانہ نگا بھی نہیں، اہل قلم بھی نہیں پھر بھی آپ کی کہانی دوسرا شرون کمار پڑھنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ عہد قدیم سے بھی ماں کے نام کا بڑا احترام کیا گیا ہے۔ شرون کمار کی کہانی میں جو ماں ہے وہ

اپنے بیٹے کے بارے میں، اسے پیٹ میں پالنے کا بڑا احسان جتا رہی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ کہیں بھی ماں، بچوں کا دکھ اندر ہی اندر جھیلتی رہتی ہے، ظاہر نہیں کرتی۔ اس کہانی میں ماں یہ کہتی نظر آتی ہے کہ میں نے نو مہینے تمہیں پیٹ میں پالا اور جنم دیا ہے۔ اپنی اولاد پر خفا ہونے کے بجائے وہ اپنیطلب دوسرے طریقوں سے بھی ظاہر کر سکتی تھی۔ دوسرے ''ندی'' میں وہ ریاستی سرکار ہو یا مرکزی سرکار سیاسی حالات اچھے نہیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی پارٹیاں شریک ہو کر حکومت چلا رہی ہیں۔ کیا اس پس منظر میں یہ کہانی لکھی گئی ہے؟

سلام بن رزاق: ندی کے بارے میں تو میں کافی کہہ چکا ہوں کہ میں نے کسی سے متاثر ہو کر یہ کہانی نہیں لکھی۔ اب رہا شرون کمار میں ماں کا احسان جتانا اور پوچھنا کہ کیا ہماری اتنی خواہش پوری نہیں کر سکتا کہ ہم کو کاشی یاترا پر لے جائے۔ شاید اس میں تلخی آ گئی ہے ماں کے الفاظ میں۔ مگر کیا ایسی مائیں نہیں ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کو بیچ دیا ہے؟ کیا ایسی مائیں نہیں ہیں جنہوں نے جنم ہو جانے کے بعد اپنے بچوں کو چرچ کے دروازے پر چھوڑ دیا ہے؟ کیا ایسی مائیں نہیں ہیں کہ جنہوں نے بیٹیوں کا سودا کیا ہے اور بیٹیوں سے دھندے کرواتی ہیں۔ ایسے کیرکٹر ہمارے بمبئی میں یا معاشرے میں، ہر جگہ آس پاس دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ ماں کی بات نہیں ہے، بات شرون کمار کی ہے۔ شرون کمار وہ عام آدمی ہے جو زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو، سارے کرب کو جھیل رہا ہے اور اس کو ڈھو رہا ہے۔ وہ شرون کمار جس طریقے سے گاڑی کھینچ کر لے جا رہا ہے اسی طریقے سے وہ گرہستی اور زندگی کو ڈھو رہا ہے اور ڈھوتے ڈھوتے اس کی جو دشا ہوئی ہے، حالانکہ وہ پورا فرماں بردار ہے۔ وہ ماں کا آرگیومنٹ اپنی جگہ پر ہے لیکن اس کو لے جانے میں اس بیٹے پر کیا گزر رہی ہے، یہ ماں کیوں نہیں سوچتی۔ کاشی یاترا جانا بہت پوتر کام ہے بہت مقدس کام ہے لیکن کل کو فرض کیجئے کہ ایک عام آدمی کے سامنے اس کی ماں یہ کہے کہ مجھے حج کو بھیجئے میں حج کو جانا چاہتی ہوں، اب حج کو جانے کے لئے ایک لاکھ روپیہ لگتا ہے اور فرض کیجئے کہ وہ عام آدمی ایک معمولی سا چپراسی ہے۔ ایک کلرک ہے، چار بچے ہیں، ایک بیوی ہے، دو بہنیں ہیں۔ ان سب کو پال پوس رہا ہے اور کل ماں اس کی کہتی ہے کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں، مجھ کو تو حج کو لے کے جا، حج کو نہیں لے جائیگا تو میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ اب وہ کیا کرے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ قرض لے کر اس کو حج کو لے کر جائے لیکن کیا اس کی ماں کا یہ کہنا اس کیلئے مناسب ہے؟ تو یہاں ماں کی بات جو ہے وہ اہم نہیں ہے بلکہ ماں نے جو بات جس پس منظر میں کہی ہے اور جس شخص کیلئے کہی ہے وہ اہم ہے اور وہ کردار جو ہے مرکزی کردار وہ شرون کمار ہے آج کا۔ ماں نہیں ہے۔ اس کہانی کو ماں کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ بیٹے کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو شاید زیادہ سمجھ میں آئے۔ دیکھئے آج کے معاشرے میں پریم چند کا آدرش واد نہیں چل سکتا تو شرون کمار کے آدرش کیسے چلیں گے۔ پریم چند نے سو پچاس سال پہلے جو آئیڈیل کہانیاں لکھی ہیں وہ آج کے زمانے، آج کے کلچر کے زمانے میں چلیں گی؟

میں نے کہانی اس رون کمار کی نہیں لکھی۔ اس وقت رام راجیہ رہا ہوگا۔ آج رام راجیہ نہیں ہے۔ آج تو کل یُگ ہے

بھائی۔ میں کل یگ کی کہانی لکھ رہا ہوں کچھ ندی کے بارے میں بتایئے؟

سلام بن رزاق: ندی میری پرانی کہانی رہی ہے۔ اور ندی کے اندر یہی ہے کہ ہرٹاپو کا جو مینڈک ہے وہ کہتا ہے: میں سردار ہوں۔ وہ یہی کہتا ہے کہ میں جو بول رہا ہوں وہی صحیح ہے۔ اصل میں جھگڑا تو وہیں سے شروع ہوتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ یہی صحیح ہے تو آپ نے سب پر دروازے بند کر دئے لیکن میں جب یہ کہوں گا کہ میں جو بات بول رہا ہوں کہ یہ میری بات ہے۔ آپ اپنی بات کہئے تو دروازے کھل جائیں گے۔ لیکن ندی کے اندر بات وہی کی ہے ہم نے کہ ہرٹاپو میں اپنا نظریہ اپنی بات کر رہا ہے اور سب کیلئے دروازے بند کر دئے ہیں اور جب دروازے بند کر دئے گئے ہوں تو کبھی بھی تازہ ہوا میں نہیں آئیں گی۔

ہری ہر پریہ: یک لویہ میں آپ نے کسی فرقے یا طبقے کے مسئلے کو پیش نہیں کیا بلکہ ایک انسانی مسئلے کو خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ میں یہ گزارش کر رہا ہوں کہ اردو ادب کی عصری صورتحال کے بارے میں کچھ بتائیں۔

سلام بن رزاق: میں چھوٹا موٹا افسانہ نگار ہوں۔ اپنے افسانے لکھتا ہوں اور سوالات کے جواب دے سکتا ہوں۔ اردو ادب بہت وسیع ہے اور فکشن کی تاریخ بھی۔ مجھے حیرت ہوئی جب میں نے مراٹھی، ہندی کا تقابلی مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ افسانہ تقریبا ساتھ ساتھ لکھا گیا ہے۔ اردو اور مراٹھی کا تو میں نے دیکھا ہے کہ دس پندرہ برس کے اندر دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلی ہیں تو افسانہ کی عمر کوئی زیادہ بھی نہیں ہے۔ ہمارا اردو افسانہ اس وقت بہت rich نہیں ہے کن معنوں میں یا کن زبانوں کے مقابلے میں۔ چونکہ میں نے بتایا کہ ہندی اور مراٹھی کے افسانے بھی میں پڑھ رہا ہوں تو ان افسانوں کے مقابلے میں اس وقت یعنی پچھلے پندرہ دس برس کے اندر بہت اچھے افسانے اسی Level کے نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ اس پورے ملک کے اندر اگر ہم فرض کیجئے پانچ یا دس افسانے نکالیں اور یہ کہیں کہ ہم یہ افسانے جو ہیں تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں رکھیں گے تو یہ انصاف کی بات نہیں ہے۔ اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں لیکن ان زبانوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ ہندی میں بہت اچھا لکھا جا رہا ہے۔ مراٹھی میں بھی بہت اچھا لکھا جا رہا ہے چونکہ میں پڑھتا رہتا ہوں، ترجمے بھی کرتا رہتا ہوں، لیکن یہ صرف ایک جواب ہے چھوٹا سا۔ لیکن اس کے اسباب جو ہیں وہ بہت بڑے ہیں۔ اس کے وجوہات جو ہیں وہ بہت آگے ہیں۔ یہ کیوں نہیں ہے ایسا یعنی اردو زبان میں افسانے یا اردو فکشن یا اردو زبان میں ادب جو ہے، وہ اب اتنا rich کیوں نہیں ہو رہا ہے؟

یہ میں بالکل اعتراف کے طور پر یا صاف گوئی کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، لیکن اس کے اسباب اب کیا ہیں اس پر غور کرنا پڑے گا۔ اس پر جب غور کریں گے تو بات بہت دور تک جائے گی۔ اردو زبان کی اس وقت ہمارے ملک میں کیا دشا ہے۔ اس کی زمین کہاں ہے؟ وہ جہاں ٹھہرتی تھی، جہاں اس کے قدم وہاں جمے ہوئے تھے، یوپی، بہار وہاں اس کی کیا دشا ہے۔ وہاں پر کوئی پرائمری اسکول نہیں ہے کہ بچے الف بے پڑھ کر نکل سکیں۔

یونیورسٹی لیول پر ڈگریاں تو لوگ لے لیتے ہیں تو وہ ماس میڈیا کی زبان نہیں بن سکتی۔ وہ لوگوں کی زبان نہیں بن سکتی۔ ڈگریاں لے کر ہم یو نیورسٹیوں میں بیٹھ کر discuss کر لیتے ہیں، افسانے لکھتے ہیں کسی کو سنا لیتے ہیں، شاعری کرتے ہیں، مشاعروں کے اندر واہ واہ بٹور لیتے ہیں، یہ زبان اور ادب کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ یہ ہماری اپنی تشفی ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر اس کو اگر صحیح طریقے سے اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ بالکل سچ ہے کہ جیسے جیسے اردو زبان انتشار کا شکار ہو رہی ہے تو لازمی طور پر ادب بھی انتشار کا شکار ہوگا۔ پانچ سو ایڈیشن کی کوئی کتاب چھپتی ہے تو پانچ برس تک ادیب اس کو بیچتا رہتا ہے جس میں سے 350 تو وہ لوگوں میں مفت تقسیم کر دیتا ہے۔ کوئی کتاب خریدنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ کوئی اخبار جو ہے وہ خریدنے کیلئے تیار نہیں تو پہلے ہم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کیا ہم نے اپنی زبان کو کس طریقے سے یعنی میں سرکار کو دوش نہیں دوں گا۔ یہ سب ہماری اپنی غلطیاں ہیں۔ Hebrew زبان دنیا سے مٹ گئی تھی تقریبا۔ تقریبا جب تک اسرائیل نہیں تھا اس زبان کو کون جانتا تھا؟ لیکن آج Hebrew زبان کا رائٹر نوبل انعام لیتا ہے۔ وہ چھوٹے سے ملک کی عبرانی زبان جو ہے سے جو کیوں برقرار رہی وہ؟ ساڑھے تین ہزار برس تک عبرانی جو ہے، اسرائیلی جو ہے وہ جہاں جہاں جاتا تھا زبان اپنے ساتھ لے کر جاتا تھا۔ تو یہ جو محبت کر زبان کی ہے۔ یہ جو محبت اپنی تہذیب سے ہونی چاہئے، یہ ہم میں جب تک پیدا نہیں ہوگی تو وہ زبان بھی جو ہے اس کے قدم بھی جو ہے لڑکھڑاتے رہیں گے اور جب زبان کے قدم لڑکھڑاتے رہیں گے تو ظاہر ہے کہ ادب سے بھی آپ بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کر سکتے۔ یہ صاف گوئی کے طور پر میں نے بات کہی ممکن ہے کہ آپ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں۔

اس تقریب میں شریک کنڑ ادیب سلام کے حالاتِ زندگی اور وہ سارے محرکات جاننے کے خواہشمند تھے جن سے ان کی کہانیوں کی صورت گری ہوتی ہے۔ سلام صاحب نے ایک بار پھر اپنے خاندانی حالات اور محرکات کا اعادہ کیا جو وہ صبح کی نشست میں بتا چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ نصف تعلیمی اخراجات کی پیش کش پر انہیں علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کا ایک موقع ملا تھا، لیکن باقی نصف کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اس پیش کش سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ لیکن جب انہیں اسی علی گڑھ کے ایک سیمینار میں صاحبِ وسائل کی حیثیت سے شریک ہونے کی عزت دی گئی تو اس محرومی کی تلافی ہوگئی۔ اس تقریب میں جناب ماہر منصور نے سلام بن رزاق اور کنڑ ادیبوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیئے۔ آخر میں ڈاکٹر جینا بڑے نے بھی انگریزی میں سلام کے ادبی موقف کی وضاحت کی۔